



ناول..... پرئی زاو: یہ دنیا ظاہر پرستوں کا ڈیرہ ہے.....

من کتنا ہی میلا کیوں نہ ہوتن اجلا ہونا چاہیے، انسان کی سب سے بڑی دشمن اس کی  
توقعات ہیں، دنیا کے بد صورت آئینوں کے مقابل..... اک حسن پرست کا فسانہ..... ہاشم ندیم

**Novel:** PariZaad  
**Written by:** Hashim Nadeem  
**Compiled by:** Muhammad Bilal Ashraf

### All Episodes: 1 - 28

Hashim Nadeem khan is a Baloch play writer whose literary services recently awarded by "Poona festival award". The famous baloch writer Hashim Nadeem was born in Quetta and got his early education from there. He obtained his intermediate education from cadet college Pataro and entered in the field of medicine. After getting medicine education from Bolan medical college of Quetta he involved himself in Blochistan civil service as assistant commissioner.

PariZaad was Published in Jang Sunday Magzine.

بائیں ہندیم تو جو ان نسل کے پسندیدہ، شنگ کے معروف و منفرد دامارائز، ناول نگار ہیں۔ ان کے ناول ”خدا اور محبت“ اور ”بچپن کا دبیز“ نے بین الاقوامی پذیرائی حاصل کی، تو جنگ، ”سندھ“ میگزین میں شائع ہونے والے ناول ”عبداللہ“ کو بھی وقت کے پسندیدہ ترین ناول کا درجہ حاصل ہوا۔ انہیں ان کی ادبی خدمات پر حکومت پاکستان نے تمغہ حسن کارکردگی سے نوازا۔ نیز، فلم کے شعبے میں ”عبداللہ“ نامی ایک بین الاقوامی فلم کے تخلیق کار کی حیثیت سے بھی قدم رکھ چکے ہیں۔

”پری زاد“ ایک اچھوتے، حساس اور قدرے مشکل موضوع پر مبنی بہت دل گدازنی تحریر ہے، یہ ایک ایسے شخص کی کتھا ہے، جسے اک کم صورتی کے عیب کے سبب اس ظاہر پسند، زر پرست دنیا کے آن گت بد صورت رویوں، بد ہیئت آنجنوں کا سامنا کرنا پڑا۔ ملاحظہ کیجیے، ہمارے ”نئے نول“ ناول کی پہلی قسط۔ ناول سے متعلق اپنی آراء سے آگاہ کرنا ہرگز مستحکم ہو لیے گا۔ ہمارا پناہی پرانا ہے:

نرجس ملک، ایڈیٹر، ”سندھ میگزین“ روزنامہ جنگ، شعبہ میگزین، اخبار منزل، آئی آئی چندر گھر روڈ، کراچی۔ ای میل:

sundaymagazine@janguroup.com.pk

ایک سرائیکی گیت ہے ”میرے محبوب یہ تیری ایک بارگی جدائی بڑی جان لیوا ہے..... مگر تجھے مجھ سے بچھڑنا ہی ہے، تو دھیرے دھیرے قسطوں میں بچھڑ.....“ اس بار کا موسم گرما بھی کچھ ایسی سنگ دل محبوب جیسا روپ دھارے دھیرے دھیرے قسطوں میں بچھڑنے کے جن کر رہا تھا۔ تیز گرم تہی دھوپ میں کول تار کی لمبی سنسان سڑک کسی سیاہ گلیشیر سے لکھلی ہوئی جھیل جیسی چمک رہی تھی۔ میرے پرانے پلیٹ جوتوں کا تلوایچے سے کئی جگہ سے گسل چکا تھا، لہذا ابلتا ہوا کول تار میرے پیروں میں اٹک رہے پھر رہا تھا۔ اسکول کی چھٹی کے بعد گھر تک یہ راستے کا پل صراط مجھے ہر روز سی پار کرنا ہوتا تھا۔ کتنی بار دپے لفظوں میں اماں کو جتا چکا تھا کہ میرے پیروں کے چھالے اب شمار کی حد سے نکلنے چارے ہیں، مگر لونہن بھائیوں میں سے فریاد کا میرٹ نکالا جاتا، تو میری عرضی کا نمبر جھٹا تھا اور باکی تنخواہ بس اتنی کہ وہ صرف اماں ہی کی سن سکتے تھے۔ راستے سے گزرتے ہوئے حسب معمول چند چلوں کے لیے جوتوں کی بڑی دکان کے چھتر تلے سنانے کے لیے ٹھہر اور ہمیشہ کی طرح حسرت بھرے تجسس کے ساتھ دکان کی شیشے کی دیوار سے ہاتھوں کا کٹورا دیکھ کر جھانکنا شروع کر دیا۔ اندر ایک ملازم، ایک میم صاحب کو اس کی پسند کے سینڈل پہنا کر جانچ کر وارہا تھا۔ کتنی پیاری تھی، وہ گوری سی میم، دودھ میں دھلی، آب شمار کی جلتی رنگ کی مانند کھری کھری سی..... مگر خیالات کا تسلسل جلد ہی ٹوٹ گیا، کیوں کہ شاید پہلے دکان کے مالک اور پھر ملازم نے بھی مجھے دیکھ لیا تھا۔ ملازم تیزی سے باہر آیا اور مختار تے بھرے لہجے میں مجھے جملے لگا۔ ”اوئے! کتنی بار تجھے کہا ہے کہ یہاں شیشے کے پاس کھڑا نہ ہوا کر، سارا شیشہ گند کر دیا۔ چل بھاگ یہاں سے، ورنہ مار کھائے گا۔“ میں جلدی سے گھبرا کر اپنا بندہ سنبھالے آگے بڑھ گیا۔ یہ نفرت و مختار تے، یہ رویہ میرے لیے، کوئی نیا نہیں تھا۔ بچپن ہی سے مجھے ایسے تحقیر آمیز رویوں کا سامنا تھا، اور پھر لوگوں سے کیا گلہ، شکوہ، میری صورت، میرا حلیہ ایسے رویے، ایسی ہی نفرت و مختار تے کا متقاضی تھا۔ میں اپنے ماں باپ کا چھٹا بچہ تھا۔ اب ایک شربت پیک کرنے والی کمپنی میں کام کرتے تھے۔ صبح سے شام تک بوتلوں کو گھٹنے کے ذبوں میں بھر کے شام کو جب گھر آتے تو ان کے غصے کا جن کھل چکا ہوتا۔ اور پھر ہم سب کو نوں کھدروں میں دیک کر باقی کا دن گزارا کرتے۔ قلیل تنخواہ، ضروریات، مہنگائی اور بے نو بچوں کی فوج۔ کبھی کبھی تو مجھے لگتا کہ یہ جو غرب والدین ہوتے ہیں، یہ اپنی غربت بانٹنے کے لیے ہی اپنا آگن بچوں سے بھر لیتے ہیں یا پھر شاید یہ ان کا غربت سے کوئی انتقام ہوتا ہے۔

وہ سردیوں کی ایک طویل اور ٹھنڈی رات تھی، جب میرا جنم ہوا۔ نانی جاتی تھیں کہ میری پیدائش کے وقت حسب معمول کم خوراک کی وجہ سے اماں کی صحت اور طبیعت کافی بگڑی ہوئی تھی۔ نتیجتاً میری صورت میں ایک کم زور، لاغر اور گھرے سانولے رنگ کا بچہ اس دنیا میں وارد ہوا۔ باقی بہن بھائی پھر بھی کافی بھرا اور کھلی ہوئی گندی رنگت لیے پیدا ہوئے تھے۔ یہ نہ جانے قدرت نے ساری سیاسی میرے مقدرد کی دوات ہی میں کیوں انڈیل دی تھی۔ چھوٹی خال کی، اماں سے ہمیشہ ہی کچھ نہ کچھ کھٹ پٹ چلتی رہتی تھی، انہیں تو جیسے موقع ہی مل گیا۔ جھٹ بولیں۔ ”آئے ہائے باجی! یہ اتنا کالا کونسا بچہ کس پر چلا گیا، لگتا ہے، جیسے آگن میں اماں کی رات اتر آئی ہے۔“ اماں جو پہلے ہی میرے رنگ کی وجہ سے جلی بھنی پڑی تھیں، جھٹلائی تو گئیں ”جیسا بھی ہے، بے تو میری ہی اولاد۔ ویسے تمہاری اس بھینگی بیٹی سے تو زیادہ ہی پیارا ہے۔“ اب جلتی باری خال کی تھی، وہ بھی تڑپ کر بولیں۔ ”ہاں ہاں، بڑا کوہ قاف کا شہزادہ بنے تم نے۔“ اماں بھلا کہاں پیچھے رہنے والی تھیں۔ ”ہاں میرے لیے کوہ قاف کا شہزادہ ہی ہے، اور میں نے تو اس کا نام بھی شہزادوں جیسا سوچ رکھا ہے۔“ ”پری زاد“ ہاں، بس یہی نام ہوگا، میرے بچے کا۔“ ”پری زاد“ آس پاس موجود سب ہی عورتیں زیر لب بڑ بڑائیں اور کن آنکھیں سے ایک دوسرے کو اشارے کرتی باہر نکل گئیں۔ ”پری بیکر تو نہ تھا، یہ پری زاد بھلا کیا نام ہوا۔“ بس وہی دن تھا، جب میری قسمت میں ہمیشہ کے لیے لوگوں کی نظر میں تھخ، طنز، طعنا اور مختار تے لکھ دی گئی تھی۔ کاش! اُس روز اماں چھوٹی خال کے قطرے کے جواب میں خاموش رہتیں تو میری زندگی اتنی تلخ نہ ہوتی۔ میری کالی سیاہ رنگت، لاغر جسم اور غیر دلکش نین نقش والی مسکین صورت کا تعارف جب پری زاد کے نام سے کروایا جاتا تو سننے والا خود بخود تہقہ لگانے پر مجبور ہو جاتا۔ مجھے یاد ہے، جب مجھے پہلی جماعت میں داخل کروایا گیا تو استاد نے سب بچوں کو فرادفا کھڑا کر کے ان کے نام پوچھے تھے۔ میری باری آئی، تو میں نے

کھڑے ہو کر معصومیت سے اپنا نام بتایا۔ ”پری زاد“ استاد چند لمحے حیرت سے میرے پرانے لباس اور ٹپے کو دیکھ کر زور سے ہنس پڑے۔ ”واہ شہزادے..... نام تو بڑا اکمال رکھا ہے، ماں باپ نے.....“ استاد کی بات پر باقی بچے بھی زور زور سے ہنسنے لگے۔ جب میری سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ آخر میرے نام میں ایسی کیا خامی ہے کہ جو بھی سنتا ہے، مذاق اڑاتا ہے، مگر پھر دھیرے دھیرے مجھے احساس ہوتا چلا گیا کہ مسئلہ نام کا نہیں، صورت کا ہے۔ اور پھر اسکول ہی کیا، گلی، محلے اور بازار میں، جہاں بھی میرے نام کی شہرت پہنچتی، پہلے تو لوگ اچھے کا شکار ہوتے اور پھر مجھ پر نظر پڑتے ہی ان کی حیرت ایک طعنے میسر کہانت میں تبدیل ہو جاتی۔ مگر میں اس وقت ایک نام سمجھ پختہ نہیں جانتا تھا کہ اس دولخی دنیا میں انسان کا سن چاہے، جتنا بھی میلا ہو، غن ضرور اچلا ہونا چاہیے۔ ہندے کے دل میں چاہے کتنا ہی کھوٹ ہو، چہرے اور صورت میں کوئی کھوٹ نہیں ہونا چاہیے۔ کیوں کہ یہ دنیا ظاہر پرستوں کا دیہ ہے۔ روح کا اچلا پن اور خوب صورتی کو برکھنے والی آنکھیں ان بے بصیرت لوگوں کے پاس کہاں؟.....

میری بد نصیبی کی داستان یہیں ختم نہیں ہوتی تھی۔ میرے ساتھ یہ مذاق تب سنگین تر ہونے لگے، جب شاید ڈھائی یا تین سال کی عمر ہی سے میرے سن میں ”نچھی“ خوب صورتی کی چاؤ“ کو اس پاس کے لوگوں نے محسوس کرنا شروع کر دیا۔ اماں بتاتی تھیں کہ بھری پڑی مٹھل میں جب کوئی مجھے پکارتا، تو میں درمیان میں بیٹھی درجن بھر عورتوں کو چھوڑ کر صرف اسی کی گود میں جا بیٹھتا، جو اس مٹھل میں سب سے اچلے چہرے والی ہوتی تھی۔ خوب صورتی کی یہ چاہ صرف خوب صورت چہرہ تک ہی محدود نہیں تھی، مجھے قدرت کی بنائی ہر خوب صورت چیز سے پیار ہو جاتا تھا، چاہے وہ پھول ہوں، رنگ، خوشبو، آسمان یا بال۔ کوئی دھن ہو، بارش یا عرف سے سجا کوئی نظارہ، کچھ بھی ہو۔ مجھے یاد ہے، میں اسکول کے رستے میں آنے والی ایک تصویروں کی دکان کے باہر مٹھنوں کھڑا خوب صورت نظاروں والی تصاویر کو دور سے دیکھ دیکھ کر خوش ہوتا رہتا تھا، مگر جیسے غریب خاندان میں پیدا ہونے والے بچے کے اندر ملتی یہ حسن پرستی تو جیسے دھڑا عذاب بن گئی۔ شاید دنیا کی ہر خوب صورت چیز پر صرف حسین لوگوں ہی کا حق ہوتا ہے۔ بد صورت لوگوں کے لیے ہر طرف صرف بد صورتی ہی چٹختی ہے۔ سو میرے اس پاس بھی ہر لمحہ وہ بد صورتی ہی، بھٹکتی رہتی، چھوٹا سا کچا گھر، کچرے سے لٹی گلیاں، دھول اڑاتا محلہ اور سب سے بڑھ کر لوگوں کی کرخت اور بد صورت موج اور نظریں۔

اس پر مگر قہر تھا شاید یہ کہ پانچویں جماعت میں، جس دن اسکول میں چچک سے بچاؤ کے ٹیکے لگانے والی سرکاری ٹیم آئی تھی، اس روز میں نہ جانے کس وجہ سے اسکول ہی نہیں چلا پایا اور ٹھیک ایک ماہ بعد میرے چہرے پر عجیب سے سرخ سرخ دانے ابھرتے دیکھ کر اماں نے چٹا کر کہا کہ ”پری زاد کے دادا، یہ لڑکے کا چہرہ تو دیکھو، یہ کیسے دانے ہیں؟“ اب بھانگم بھاگ مجھے لیے سرکاری اسپتال نیکا لگاؤ نے پہنچ گئے، مگر جب تک بیماری اپنا کام کر چکی تھی اور پھر جب چند مٹھنوں بعد زخموں کا کھربڑا اثر تو بیماری ساری عمر کے لیے چہرے پر چپکے کے بدمذائقوں کی نشان چھوڑ چکی تھی اور ان داغوں سے بھی کہیں زیادہ گہرے داغ اور زخم تو مجھے ان لوگوں کی باتوں نے لگائے، جو بظاہر بیمار داری کرنے اور اماں سے ہم دردی بتانے آتے تھے، مگر بی مذاق کی تہ میں، طعنے کے ایسے شہر اور تیر چلاتے کہ اس چھوٹی عمر میں بھی میرا دل پھٹتی ہو کے رہ جاتا۔ کون کہتا ہے، انسان نے اس جدید دور میں میزائل، بم اور ڈرون ایسا کر کے جانی پھیلائی ہے۔ جتنا گہرا گھاؤ انسان کی زبان کسی انسان کے دل میں لگا سکتی ہے، اس کی کاٹ اور زخم کا مقابلہ، یہ نئے دور کے ہتھیار کسی صورت نہیں کر سکتے۔ کبھی کبھی میں سوچتا کہ انظم کے موجد کو شاید زبان کے زہر کا ٹھیک طرح سے ادراک نہیں ہوگا، ورنہ اسے دنیا پر باد کرنے کے لیے اتنی محنت نہ کرنا پڑتی۔

شاید میرے والدین کا بھی اس معاملے میں اتنا تصور نہیں تھا۔ جب کسی غریب گھرانے میں کیے بعد دیکھو کہ اوپر نیچے نپٹے پیدا ہو جائیں، تو پھر ان میں سے کسی ایک بچے کی حساسیت کا بھلا کسے خیال رہتا ہے۔ یہ میری اپنی بد قسمتی تھی کہ میں ایسی صورت کے باوجود بھی اندر سے بے حد حساس واقع ہوا تھا۔ کاش! انسان اس دنیا میں صرف غریب ہی پیدا ہوتا یا صرف نازک دل۔ مجھ جیسے لاکھوں کر دوڑوں بچے اس ملک کی ان ہی گلی کوچوں کی دھول چاٹتے رل کھل کر بڑے ہو ہی جاتے ہوں گے، مگر میری حساسیت نے میری زندگی کا خاردار میرے لیے طویل تر کر ڈالا۔ میں جتنا لوگوں کی آنکھوں سے چھپتا، اتنا ہی ان کی نظر میں آ جاتا تھا۔ اور پھر میرے اندر پلتا وہ ایک حسن پرست پری زاد، جسے ہر خوب صورت چہرہ اس قدر بھاتا تھا کہ دل کی دھڑکن تیز ہو جاتی تھی۔ مجھ سے بڑی تین بہنیں اور سب سے بڑے دو بھائی اور مجھ سے چھوٹی ایک بہن اور دو بھائی سب ہی کی زندگی حُرے میں گزر رہی تھی، کیوں کہ انہیں نہ تو اپنی زندگی سے کوئی توقع تھی، اور نہ ہی جیون کا برابر تاناؤں سے کچھ الگ تھا۔ شاید زندگی میں سب سے بڑی دشمن ہماری اپنی توقعات ہی ہوتی ہیں۔ کانٹوں میں الجھاؤ رکھنے والی امیدیں، مگر حقیقی ریت پر چلنے پر مجبور کر دینے والی توقعات۔ میں آٹھویں جماعت میں تھا، جب دو بڑے بھائیوں کی اکٹھی شادی کر دی گئی، گھر میں دو افراد کا اضافہ ہو گیا اور ہم سب بہن بھائی اپنی اپنی مخصوص جگہوں سے سرکتے باہر برآمدے اور صحن میں آگئے، چھوٹے سے گھر کی تقسیم کتنی مشکل ہوتی ہے۔ جہاں باتیں تو درکنار، ایک دوسرے کی سوچ بھی سنائی دے جاتی ہے۔ لہذا دھیرے دھیرے ہم، بہن بھائیوں کی سوچ بھی سرگوشیاں ہوتی چلی گئی۔ شاید مجھ پر اور غلامی کی انتہا بھی پہنچتی ہوئی ہوگی کہ انسان اپنی سوچ کی بولی بھی اونچی نہ ہونے دے، سوچنا بھی سرگوشیوں میں شروع کر دے۔



بھائیوں کی شادی کے بعد گھر کی مزید آبادی بڑھی تو ہم سب کو مزید سرکادیا گیا۔ کمرے والے برآمدے میں، برآمدے والے گھن میں اور میں جو گھن میں سوتا تھا، میرے لیے فرمان صادر ہوا کہ باقی بھائی، بہن چوں کہ چھوٹے ہیں، لہذا مجھے گھر کی چھت پر بنے ایک کچے گودام نما کمرے میں منتقل ہونا پڑے گا۔ چھت پر بنیں اور مٹی کا بنایا چھوٹا سا کمرہ گھر کا کٹھ کاہن خراج کرنے کے کام آتا تھا۔ غریبوں کی زندگی میں کوئی چیز فالتو نہیں ہوتی۔ ایک سال پہلے جس شے کو فالتو سمجھا تھا اس گودام میں پھینک دیا جاتا تھا۔ اگلے سال اسی کی تلاش میں اماں اور بڑی بہنیں سارا گودام الٹ پلٹ رہی ہوتی تھیں۔ میرے لیے بھی یہی حکم تھا کہ میں گودام کی تمام "قیمتی اشیاء" ایک طرف سلیقے سے لگا کر اپنی پرانی چار پائی اس گودام میں ڈال لوں۔ آتے وقت میں اپنی کورس کی کتابیں بھی وہیں اٹھا لا یا۔ اب اسکول سے واپسی پر کھانا کھانے کے بعد میں چپ چاپ اوپر بنے گھن کی چھت والے کمرے میں چلا آتا۔ شروع شروع میں مجھے یہاں کچھ غصے سی محسوس ہوتی، مگر پھر دھیرے دھیرے اپنی اس تنہائی سے سکون ملنے لگا۔ یہ تنہائی میرے پورے وجود میں سرایت کرنے لگی اور پھر جیسے میری، اپنی اس تنہائی سے دوستی سی ہو گئی۔ تنہائی میں ہم خود اپنے ساتھ ہوتے ہیں اور مجھ جیسا لڑکا، جسے کسی ساتھی کا بھی ساتھ بہتر نہیں تھا۔ اس کے لیے اپنا یہ ساتھ کتنا غیبت تھا۔ یہ میں ہی جانتا تھا، آہستہ آہستہ میری ہی تنہائی مجھ سے باتیں کرنے لگی۔ وہ مجھے اوروں کی طرح بد صورت، لاغر اور کم تر نہیں سمجھتی تھی۔ بلکہ میں اس کے لیے حقیقت میں ایک پری زانو تھا، وہ میرے ساتھ مختلف دل چسپ کھیل کھیلا کرتی۔ میری تنہائی کبھی مجھے اسکول کا سب سے لائق ہونہار طالب علم بنا دیتی، جو ضلع بھر میں اول پوزیشن لینے کے بعد کچھ کچھ بھرے ہال میں ہیڈ ماسٹر سے ٹرائی وصول کر رہا ہوتا، تو کبھی اسکول کا سب سے بہترین کھلاڑی بن کر سارے مقابلے جیت رہا ہوتا اور میری ہر کامیابی پر سارا اسکول دیوانہ دار تالیاں بجاتا۔ غرض، میری تنہائی نے میرا ہر وہ خواب بچ کر دکھایا، جس کا میں عام زندگی میں کبھی تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ کلاس میں، ہمیں ایک درسیانے درجے کا شرمیلا طالب علم تھا، جس نے غیر ضابطی سرگرمیاں تو دور، کبھی انصاف میں بھی کوئی غیر معمولی کارکردگی نہیں دکھائی تھی۔ اگر غلطی سے استاد کبھی مجھ سے کوئی سوال پوچھ بھی لینے تو میری ناخنیں کاٹنے لگتیں۔

مجھ سے بڑے بھائیوں نے تو جیسے تیے دوسروں کا امتحان پاس کر کے چھوٹی موٹی نوکریاں شروع کر دی تھیں۔ اور اب اپنی دنیا میں مگن تھے اور ان ہی دنوں، جب میں دوسروں جماعت میں تھا۔ میری بڑی بہن کی بات کہیں طے ہو گئی اور اس کے سسرال والوں کی ضد کے آگے ہار کر اباکور بھتی کی ہامی بھرتے تھی۔ ہماری برسوں کی گئی بندھی زندگی کی روئیں میں ایک ذرا سی لچل پیدا ہوئی اور اماں نے اس پاس کی پڑوسوں اور لڑکیوں بایوں کو ڈھونڈنے کے لیے ہفتہ بھر پہلے ہی روزانہ شام کو گھر آنے کی دعوت دے دی، ایسے مواقع پر میں زیادہ تر چھت پر اپنے ذریعے نما کمرے ہی میں قید رہتا، حالانکہ دل بہت چاہتا تھا کہ صحن میں جھانک کر محلے کی لڑکیوں کو شور مچا دوں اور ہنگامہ کرتے دیکھوں۔ ان کی فحشی اور قہقہوں کی آواز اوپر کرے تک آتی، تو کبھی بار چھت کی منڈ پر تک بھی آتا، مگر پھر واپس لوٹ جاتا۔ اگر کسی کام سے گھر سے باہر بھی جانا ہوتا، تو چپ چاپ گھن کی چھت کی جانب سے نیچے اترتا۔

ان دنوں سر شام ہی محلے کے نوجوان لڑکے ہماری گلی کے ارد گرد منڈلانے لگے تھے اور میری اماں یا ابا کے بلاوے پر بھاگ بھاگ کر گھر کے کام یوں کرتے، جیسے یہ ان کا فرض ہو۔ مجھ پر یہ بھید بہت دیر میں ٹھکرا کہ ان میں سے ہر ایک محلے کی کسی نہ کسی لڑکی کی ایک جھلک دیکھنے کی آس میں یہ "گلی یاترا" کرتا ہے۔ کبھی کبھار ان کے قریب سے گزرتے ہوئے ان کی سرد آہیں اور عشقیہ جملے میرے کانوں میں بھی پڑ جاتے۔ "یارا کیا ہوا، وہ آئی کہ نہیں؟" "کہاں یارا اس کا تو گھر سے کتنا ہی عذاب ہو چلا ہے، ٹو بتا میری والی آئی کہ نہیں؟" "ہاں، آئی تو ہے، پر اس کی اماں کی بڑی کڑی نگرانی ہے آج کل اس پر، سوچتا ہوں، خطا پکڑانے کی کوئی ترکیب کروں۔" میں حیرت سے ان سب کی یہ باتیں سننا اور رشک سے ان سب کو دیکھا کرتا، میری نظر میں وہ سب لوہر فہر عظیم درجہ رکھتے تھے۔ بھلا اس دنیا میں کسی کا محبوب بننے سے بھی بڑا کوئی درجہ ہو سکتا ہے۔ عاشق تو لا کھل جائیں گے، محبوب کے درجے پر شاد و نادر ہی کوئی فائز ہوتا ہے۔ یہ خود کو کتنا مکمل کر دینے والا احساس تھا کہ کوئی اس دنیا میں ایسا بھی ہے، جو اپنی قربانی میں آپ کو سوچتا ہے، آپ کی فکر کرتا ہے، آپ کی یاد اس کے ہونٹوں پر ایک مٹھی سی مسکان نکھیر دیتی ہے۔ مجھ جیسے معمولی لڑکے کے لیے تو یہی زندگی کی معراج تھی کہ محلے کی کسی لڑکی نے میری طرف دیکھنا تو درکنار، کبھی ایک اپجٹی سی نگاہ بھی نہیں ڈالی۔ لڑکیاں تو لڑکیاں، مجھ سے تو محلے کے خوب زور کے بھی بات کرنا پسند نہیں کرتے تھے۔ وہ گھٹنوں آپس میں اپنے معاشقوں کی باتیں کرتے رہتے اور میں ان کے قریب بیٹھے ہونے کے باوجود کبھی اتنی توجہ کا باعث بھی نہیں بن سکتا تھا کہ ان میں سے کوئی مجھ سے اتنا ہی کہہ دے کہ "بھائی جاؤ، جا کر اپنا کام کرو، کہاں ہمارے درمیان گھسے بیٹھے ہو؟" ان میں سے اگر کبھی کسی کی کوئی اپجٹی نگاہ مجھ پر پڑتی جاتی تو وہ بڑی بے پروائی سے کہتا "یار پری! جلدی سے جا کر ایک ڈیپا کیپٹن کی تو پکڑا۔" ہم سب عمر کے اس دور میں تھے، جہاں گھر والوں سے بچپ کر سگریٹ پینا بھی ایک کارنامہ سمجھا جاتا تھا اور ان کی نظر میں میری وقعت بس اتنی تھی کہ میں ان کی یہ کبکی بھنگی خدمت کرتا رہوں۔ یا پھر یوں کہہ لیں کہ میں ان کی نظر میں قطعاً بے ضرر تھا، عاشق کو خطرہ صرف اپنے رقیب سے ہوتا ہے اور میری اتنی اوقات ہی نہیں تھی کہ میں کسی اونچی درجے کے رقیب کے عہدے پر ہی فائز ہو سکوں۔

ان دنوں محلے میں ناہید نامی لڑکی کا بہت چرچا تھا۔ محلے کے سبھی لڑکوں کی فینڈیں حرام کر رکھی تھیں، اس پر ہی چہرہ نے۔ اور ہماری گلی میں جمع ہونے والی اس بھیز کی بنیاد و وجہ بھی ناہید ہی تھی۔ کیوں کہ وہ روزانہ اپنی ماں کے ساتھ مغرب کے بعد ہمارے گھر کی تقریب میں شامل ہونے آتی تھی۔ بیٹے نظریں جکائے اور سر پر اوڑھنی اوڑھے ناہید کو میں نے بھی ایک آدھ بار گلی میں آتے جاتے دیکھا تھا۔ سفید لباس میں وہ کتنی پاکیزہ اور کتنی معصوم دکھائی دیتی تھی۔ شادی کا دن قریب تھا اور گھر میں ہنگامہ بھی اپنے عروج پر پہنچ چکا تھا، جب ایسی ہی ایک شام میں گھر کے صحن سے گزر کر کسی کام سے باہر جانے کے لیے نکلا تو صحن میں پٹنجی کسی لڑکی کی آواز سنائی دی۔ ذرا نیچے..... میں نے پلٹ کر دیکھا اور میری سانس گھٹن گئی، مجھے پکارنے والی کوئی اور نہیں، ناہید ہی تھی۔

(جاری ہے)

بائیں تدم نو جوان نسل کے پسندیدہ، ملک کے معروف و منفرد رمارا نثر، ناول نگار ہیں۔ ان کے ناول ”خدا اور محبت“ اور ”بچپن کا دبیز“ نے بین الاقوامی پذیرائی حاصل کی، تو جنگ، سنڈے میگزین میں شائع ہونے والے ناول ”عبداللہ“ کو بھی وقت کے پسندیدہ ترین ناول کا درجہ حاصل ہوا۔ انہیں ان کی ادبی خدمات پر حکومت پاکستان نے تمغہ حسن کارکردگی سے نوازا۔ نیز، فلم کے شعبے میں ”عبداللہ“ نامی ایک بین الاقوامی فلم کے تخلیق کار کی حیثیت سے بھی تدم مہر کچے ہیں۔

”پری زاوا“ ایک انچھوٹے، حساس اور قدرے مشکل موضوع پر مبنی بہت دل گدازنی تحریر ہے، یہ ایک ایسے شخص کی کتھا ہے، جسے اک کم صورتی کے عیب کے سبب، اس ظاہر پسند، زہر پرست دنیا کے اُن گنت بد صورت رویوں، بد ہیئت آئینوں کا سامنا کرنا پڑا۔ ناول سے متعلق اپنی آراء سے آگاہ کرنا ہرگز مت بھولیے گا۔ ہمارا پتا وہی پرانا ہے:

ایڈٹر، ”سنڈے میگزین“ روزنامہ جنگ، شعبہ میگزین، اخبار منزل، آئی آئی چندر نگر روڈ، کراچی۔ ای میل:

sundaymagazine@jangurop.com.pk

تھوڑی دیر کے لیے تو مجھے اپنے کانوں پر یقین ہی نہ آیا۔ میں نے گھبرا کر ادھر ادھر دیکھا، جیسے میرے پیچھے یا مٹھن میں آس پاس کوئی اور موجود ہے، جسے ناہید نے آواز دی ہوگی۔ مگر وہاں تو میرے سوا کوئی نہ تھا۔ میری نظر ایک بل کے لیے اس کی جانب اٹھی اور اس کی سیاہ مٹھی پلکوں اور بڑی بڑی خوب صورت آنکھوں سے ٹکرا کر دوسرے ہی بل زمین میں گر گئی۔ شاید دنیا کا سب سے بڑا لحاظ یار عجب، لحاظِ حسن، یار عجبِ حسن بھی ہوتا ہے۔ اور میرے لیے تو یہ ویسے بھی ایک ناقابل یقین اور انہونی تھی۔ میں نے اس لڑکی کے لیے محلے کے کڑیل جوانوں کو توجہ دو پہروں میں گھنٹوں اسکول کے رستے میں کھڑے بننے دیکھا تھا، مگر وہ اسکول سے واپسی پر یا کبھی محلے سے گزرتے ہوئے آنکھ اٹھا کر بھی کسی کی طرف نہیں دیکھتی تھی۔ حال ہے، جو آج تک کسی نے اسے نیگے سر دیکھا ہو۔ آج وہی محلے کی سب سے خوب صورت لڑکی مجھ سے براہِ راست مخاطب تھی۔ مجھ سے، جسے اس کے اپنے گھروالے بھی عموماً بھول جاتے تھے۔ میں تو اگر کھانے کے لیے کبھی دیر سے چھت سے نیچے آتا، تو عام طور پر چھوٹے بہن بھائی سب مفاہمت کر چکے ہوتے اور اماں مجھے دیکھ کر سر پٹ لیا کرتیں کہ ”ارے..... ٹو تو مجھے یاد ہی نہیں رہا۔“ پھر میں کیوں حیران نہ ہوتا، جب اس نے میرا نام لے کر وہ بارہ پوچھا۔ ”آپ خالہ منگراں کے بیٹے ہیں ناں..... پری زاوا.....“ میرا جی چاہا کہ اسے روک کر کہوں کہ پری تو آپ ہیں، میں تو صرف زاوا ہی زاوا ہوں۔ مگر میرے حلق سے عجیب و غریب سی آواز نکلی۔ ”جی.....“ ”آپ ذرا اس شادی کے ہنگامے سے فارغ ہو لیں، تو ایک بار ہمارے گھر کا چکر لگ لیجیے گا۔ میری امی آپ کو یاد کر رہی تھیں۔“ وہ بات ختم کر کے نہ جانے کب کی جا بھکی تھی، مگر میرے قدم تو جیسے وہیں مٹھن کی ہلکی زمین میں دھنس کر رہ گئے۔ میں جانے کتنی دیر وہیں کھڑا ان چند گھنٹوں کے خواب یا گمان ہونے کے بارے میں سوچتا رہا۔ میرا ذہن یہ تسلیم کرنے کو ہرگز تیار نہ تھا کہ وہ بل حقیقت بھی ہو سکتے ہیں، جب وہ مجھ سے ہم کام تھی۔ واقعی کچھ لوگ ہمارا نام پکاریں، تو نام بھی معتبر لگنے لگتا ہے۔

میں جیسے کسی ظلم کے زیر اثر باہرنگی میں نکلا تو حسب معمول لفظوں کی ایک ٹولی گلی کے ٹکڑ پر جمع تھی۔ وہ سب اس کی باتیں کر رہے تھے۔ ان میں ماہد بھی تھا۔ محلے کا سب سے کڑیل اور خوبرو جوان، میرے ہم عمروں میں سب سے زیادہ زندہ دل اور ہر محفل کی جان، پڑھائی لکھائی میں بھی آگے اور شام کو جب محلے کے باقی لڑکے بڑے میدان میں کرکٹ کھیلا کرتے، تو ماہد کی تیز باؤ لنگ اور ہوا میں اڑتے لیے بال دیکھنے کے لیے ہم سبھی قماشائی گھنٹوں کھڑے رہا کرتے۔ میں پپ چاپ ٹکڑ پر کھڑے لڑکوں کی ٹولی کے پاس آ کر کھڑا ہو گیا۔ وہ سب ناہید ہی کا ذکر کر رہے تھے۔ ان سب نے خود اپنے طور پر ہی، اپنی پسند کے مطابق محلے کی لڑکیاں اپنے اپنے ناموں سے منسوب کر رکھی تھیں۔ اور ماہد کے نام کا قمر اس کی جاذبِ نظر شخصیت اور ہر دل عزیز کی وجہ سے ناہید کے نام نکلتا تھا۔ ماہد غور بہت عرصے سے ناہید کے گھر کے چکر کاٹ کاٹ کر تھک چکا تھا۔ مگر بقول اس کے، وہاں اس کی دال گنتی نظر نہیں آتی تھی۔ اس وقت بھی وہی ذکرِ جاں جاری تھا۔ اکرم نے پوچھا ”یارا بتا تو سہی، کچھ بات تو کی ہوگی اس نے تجھ سے.....“ ماہد نے ایک لمبی سی سرد آہ بھری۔ ”کہاں یار..... اُس نے تو جیسے مجھ پر نظر نڈالنے کی قسم کھا رکھی ہے۔ جانے کب اپنے بھاگ نکلیں گے“ پھر چاک ماہد کی مجھ پر نظر پڑی۔ میں منہ کھولے محویت سے ان کی باتیں سن رہا تھا۔ ماہد نے ایک دم ہی مجھ سے سوال کر ڈالا۔ ”ارے پری زاوا..... ٹو نے کبھی کسی سے عشق کیا ہے.....؟“ سب لڑکوں نے ماہد کی بات سن کر زوردار قہقہہ لگایا۔ میں شرمندہ سا ہو گیا۔ ”میں نے..... نہیں تو.....“ ماہد شہیدہ سی شکل بنا کر بولا۔ ”ہر کسی کو زندگی میں ایک بار عشق ضرور کرنا چاہیے۔ عشق آدمی کو انسان بنا دیتا ہے۔“ اکرم نے شرارت سے ماہد کی طرف دیکھا اور معنی خیز لہجے میں بولا۔ ”صرف ایک بار، ذرا پھر سوچ لے ماہد۔“ سب لڑکے ایک بار پھر زور سے ہنس پڑے۔ سارا محلہ جانتا تھا کہ نہ صرف ہمارے محلے، بلکہ آس پاس کی جانے کتنی گلیوں میں ماہد کے چکر چلتے تھے۔ ایک بار تو میرا جی چاہا کہ میں بھی ان سب کو آج ہی ہٹا کر حیران کر دوں کہ جس ناہید کی ایک جھلک پانے کے لیے وہ سب یہاں گھنٹوں سے کھڑے ہیں، اُسی ناہید نے آج خود مجھ سے نہ صرف بات کی بلکہ اپنے گھر بھی نکال دیا ہے۔ مگر پھر یہ سوچ کر خاموش ہو گیا کہ بھلا کون میری بات پر اکتہار کرے گا۔ اٹا



مزید مذاق بنے گا۔

وہ میری زندگی کی پہلی رات تھی، جو مجھ سے گزارے نہیں گزر رہی تھی۔ پہلے تو میں اپنے کمرے ہی میں چار پائی پر کروٹیں بدلتا رہا، پھر تنگ آ کر اس جھلکی چار پائی کو کمرے سے باہر کھینچ کر گھلے آسمان تلے تاروں کی چھت کے نیچے ڈال دیا اور پھر ساری رات تاروں سے پوچھتا رہا کہ آخر ایسی کیا بات ہو سکتی ہے، جس کے لیے اس "ستارہ جبین" نے مجھے اپنے گھر آنے کو کہا ہے؟ کہتے ہیں، جادوگر اور بازیگر نہیں کھلا دھوکا دیتے ہیں۔ یہ ہماری نظر بندی کر کے جانے کیسے کیسے کھیل تماشے دکھا جاتے ہیں۔ آنکھوں میں دھول جھونکتے ہیں مگر اس رات مجھے یہ احساس ہوا کہ سب سے بڑا جادوگر اور ماہر ترین بازیگر تو خود ہمارے سینے کے اندر دھڑکتا یہ دل ہوتا ہے۔ جادوگروں اور بازیگر کی نظر بندی کا علاج تو شاید پھر بھی ممکن ہو، مگر اس کم بخت دل کی نظر بندی کا کوئی علاج نہیں۔ میرے دل نے بھی اس رات میری عقل پر پردے ڈال کر میری نظر بندی کر دی تھی۔ اپنے سیاہ چہک زدہ چہرے کو بھلا کر میں کسی شہزادے کی طرح ساری رات اپنے سنہوں میں ناہید کا ہاتھ تھا سے انجان وادیوں میں بھٹکتا رہا۔ کبھی کبھی ہمارے خواب بھی کتنے خوب صورت ہو جاتے ہیں، شاید اسی لیے انہیں "خواب" کہا جاتا ہے۔

اس رات کے بعد نیند تو جیسے مجھ سے روٹھ ہی گئی تھی۔ جیسے تیسے کر کے میں نے شادی کے دن گزارے اور پھر فصحتی کے ٹھیک دوسرے دن چھپکتے ہوئے ناہید کے گھر کے دروازے پر دستک دے دی۔ ناہید کے ابا نے دروازہ کھولا، جنہیں ہم سب مرزا چچا کہتے تھے۔ ان کا غصہ سارے محل میں مشہور تھا۔ "ہاں، بھئی، کیا بات ہے.....؟" انہوں نے کڑک دار لہجے میں مجھ سے پوچھا۔ میں ہلے بھر کے لیے تو بولا ہاٹ میں سب بھول گیا۔ وہ دوبارہ گرجے۔ "اب کچھ بولو گے بھی یا پونی منہ میں گھنگنیاں ڈالے کھڑے رہو گے.....؟" میں گھٹکھٹایا "جی..... وہ..... میں..... مجھے بلایا تھا خالہ نے....." انہوں نے خیرت سے مجھے ایک بار پھر سر سے پیر تک غور سے دیکھا۔ "اندرا جاؤ....." میں اس وقت کوکوں رہا تھا، جب میں نے یہاں آنے کا فیصلہ کیا تھا، بہر حال اب واپسی کا کوئی راستہ نہیں تھا۔ کچھ دور میں ناہید کی امی آگئیں اور غصہ یہ کھلا کہ ناہید کے نوے جماعت کے پرچے ہونے والے تھے اور سالانہ امتحانات میں اسے اردو کے مضمون میں رہنمائی چاہیے تھی۔ جانے اس کی امی کو کس نے یہ کہہ دیا تھا کہ میری اردو بہت اچھی ہے۔ مجھے خود بھی یقین نہیں آرہا تھا، کیوں کہ مجھے پوری زندگی میں آج تک اتنی اہمیت کبھی نہیں ملی تھی۔ مٹے یہ پایا کہ میں شام کو چار سے پانچ بجے تک ایک ٹھنڈے ناہید کو اردو کی تیاری کروا جایا کروں گا۔ مرزا صاحب نیوشن کی فیس بھی مقرر کرنا چاہتے تھے، مگر میں نے انہیں ٹال دیا۔ ناہید کے گھر سے نکلنے کے بعد بہت دیر تک تو مجھے کچھ سمجھ ہی نہیں آیا کہ اس خوب صورت حادثے پر میرا رد عمل کیا ہونا چاہیے۔ رات تک میں ایک صدے کی سی کیفیت میں رہا۔ صدے کا تعلق ہمیشہ غم ہی سے نہیں ہوتا، کبھی کبھی اچانک بدل جانے والی بے پناہ خوشی بھی ہمارے عموں روئے سے متصادم ہو جاتی ہے۔ شاید ساری بات ظرف کی ہے، خوش ہو یا غم، ہمارے ظرف کے پیمانے سے بڑھ جائے تو ہم اپنی ظاہری شخصیت کا رکھ رکھاؤ کھو بیٹھتے ہیں، میرے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی معاملہ ہوا اور اگلے دن، تین چار مرتبہ اماں اور بڑے بہن بھائیوں سے مختلف باتوں پر ڈانٹ پڑ گئی۔ مثلاً میں عام طور پر شاذ و نادر ہی آئینہ دیکھا کرتا تھا بلکہ بچ کو یہ ہے کہ مجھے آئینے سے ڈر لگتا تھا۔ مگر اُس روز، جب لگاتار تیسری مرتبہ برآمدے میں گئے آئینے کے سامنے سے گزرتے ہوئے میں نے شیشے میں جھانکا تو برآمدے میں کچھ کام کرتے بڑے بھائی نے مجھے گھورا "خیر تو ہے..... یہ کتنی پنی آج کس خوشی میں کی جارہی ہے؟" میں ٹپٹا سا گیا۔ "تمہارے دوستوں کے امتحانات سر پر ہیں، اپنی پڑھائی کی طرف دھیان دو، آئینہ دیکھنے کے لیے ساری زندگی پڑی ہے۔" میں جلدی سے سر ہلا کر وہاں سے ہٹ گیا۔ اس روز گھڑی کے ہندسوں کی جھ سے جیسے کوئی جنگ سی جارہی تھی۔ میں ٹھنڈے بھر بعد بھی گھڑی کی طرف دیکھتا تو سوئی صرف چند منٹ ہی آگے ٹھکی ہوئی۔ شاید گزرتے وقت کا تعلق کسی سوئی یا گھڑی سے نہیں ہوتا۔ وقت ہمیشہ ہماری لمحوں کے ساتھ ضد سے ناپا جاتا ہے۔ ہماری مرضی کے خلاف ہمیشہ ہماری خواہش کے برعکس گھڑیوں کے گزرنے کو وقت کا نام دے دیا گیا ہے۔ جب ہم اسے تیز تر چاہتے ہیں، یہ سست تر ہو جاتا ہے، اور جب کبھی ہم اس کے آہستہ پن کی دعا اور انتہا میں گڑ گڑا رہے ہوتے ہیں، اسے پر لگ جاتے ہیں، تو پھر ہم بھولے انسان کو وقت کو گھڑی یا سوئی کے پیمانے پر کیوں ناپتے ہیں۔ بس، اپنے دل میں جھانک کر اپنی خواہش کو نالایا کریں، وقت ہمیشہ اس کی مخالف سمت ہی دوڑتا ملے گا۔

ٹھیک چار بجے شام، میں ناہید کے دروازے پر دستک دے رہا تھا۔ گلی میں اکا دکا لوگ آ جا رہے تھے، ٹھکر ہے، اس وقت ماجدا اور اس کے دوستوں کی ٹولی وہاں سوچہ جمائے نہیں بیٹھی تھی، ورنہ مجھے ہزار سوالوں کا سامنا کرنا پڑتا۔ دروازہ ناہید کے چھوٹے بھائی نے کھولا۔ اور مجھے اندر لے جا کر صحن میں گلی انکوروں کی ٹیل کے نیچے چھپی کرسی پر بٹھا دیا۔ سامنے ایک چھوٹی سی میز اور دوسری کرسی بھی رکھی ہوئی تھی۔ میرا دم بھول رہا تھا۔ دھڑکنے بے قابو تھی، اور سانس رک رک کر آ رہی تھی۔ میں نے بچپن ہی سے اپنے لیے لوگوں کی نظر میں اس قدر حقیر اور متواضع دیکھا تھا کہ مجھے براہ راست اوپر دیکھنے یا سامنے والے کی آنکھوں میں دیکھ کر بات کرنے کی عادت ہی نہیں رہی تھی، لہذا جب ناہید اپنا سیاہ اور پلاسٹک میز پر جمائے ہوئے آکر بیٹھی، تو جب بھی میری نظر میں نیچے زمین ہی میں گڑی ہوئی تھیں۔ حتیٰ کہ جب اس کے گورے پاؤں سیاہ سینڈلز میں جکڑے میری نظر کے دائرے میں آئے تو میں نے گھبرا کر اپنی آنکھیں مزید ٹھکا لیں اور خود اپنے جوتوں کو دیکھنے لگا۔ ناہید نے کتابیں میز پر رکھ دیں اور شاعری کا باب نکال کر بولی۔ "سب سے پہلے تو آپ مجھے یہ میر تقی میرا دردور کی شاعری کی تشریح کرنا سکھا دیں۔ ہمیشہ یہ سوال مجھ سے رو جاتے ہیں۔" میں نے کھاکر کر گلا صاف کیا، جیسے کوئی غائب دماغ مقرر حاضرین سے کچھ کچھ بھرے ہال کے سامنے اسٹیج پر آ کر ایک دم اپنے دماغ سے بیٹ جانے والی تقریر کو یاد کرنے کی کوشش میں وقت ضائع کرتا ہے۔ پتا نہیں، میں نے شعری تشریح کیا کی اور نثر کا باب کہاں سے شروع کر کے کہاں ختم کیا۔ ناہید کے کول ہاتھ صفحے پلٹتے گئے اور میں اس کے ہاتھوں کی لکیروں میں اپنا ڈوبا ہوا مقدر تلاش کرتا رہا۔ ٹھیک پانچ بجے ناہید کی امی جانے کا کپ لے کر آگئیں اور میں نے حیرت سے برآمدے میں گلی بڑی گھڑی کی طرف دیکھا۔ ایک ٹھنڈے گزر بھی گیا۔ پھر وہی وقت کی ہماری خواہش سے جنگ.....؟ میں جانے کا کپ ختم کر کے وہاں سے نکل آیا۔ میں نے زندگی میں کبھی نہ نہیں کیا تھا، مگر کبھی کبھی سرور کا تعلق صرف کسی نشہ آور شے سے نہیں ہوتا۔ کچھ ہلے ایسے ہوتے ہیں، جب فضا میں، ہوا میں، آس پاس کے ماحول ہی میں نشہ کھل جاتا ہے۔ کتنے خوش نصیب ہوتے ہیں وہ لوگ، جو دن چپے، ہنسا کئی گناہ کے بوجھ تلے دیے اس سرور کا نشہ لیتے ہیں۔ اس مرد میں بھی پورا دن، جس کا نشہ فٹے کے سرور میں رہا۔ مگر کہتے ہیں کہ دنیا کا ہر نشہ عارضی ہوتا ہے، عموماً رات بھر کے خماری کے بعد صبح اتر ہی جاتا ہے۔ میرا نشہ بھی صبح آئینے میں اپنا چہرہ دیکھتے ہی بھک سے اڑ گیا۔ میں بے خیالی میں کتنی گھڑیوں کے لیے اپنے کمرے میں لگے ٹوٹے اور میلے سے آئینے کے ایک ٹکڑے میں اپنا چہرہ دیکھ بٹھا اور میرے سارے پٹے پل بھر میں کچی کچی ہو گئے۔ کاش یہ آئینا بکوات ہوا ہوتا تو ہم جیسوں کے لیے دنیا اتنی مشکل جگہ نہ ہوتی۔ اس پل میرا جی چاہا کہ دنیا کے سارے آئینے



تو ڈالوں یا کاش ایسا ہو جائے کہ دنیا کے سارے ٹوب صورت اندھے ہو جائیں۔ یا پھر اوپر والے نے دنیا میں ہر صورت ایک ہی بنیادی ہونی، لو اس بصارت یا آئینے کی ضرورت ہی نہ رہتی۔

اگلے روز ناہید کے گھر کے باہری مجھے ماجد نے دھرایا۔ ”ہاں بشیر اے! کیا چکر ہے، ہماری جینی کے گھر، وہ بھی ہم سے ٹھپ ٹھپ کے.....!“ میں نے ماجد کو ٹیوٹن والی بات بتائی۔ ماجد نے ایک لمبی سی سر آؤ بھری۔ ”ہاں میاں! یہی تو فائدہ ہے ہوتے ہیں لکھ پڑھ جانے کے۔ چلو پیش کرو، میری قسمت میں تو ویسے بھی اس ظالم کی نظر نہیں ہے۔ کبھی پلٹ کر دیکھتی تک نہیں۔“ پھر ماجد کو جیسے کچھ یاد آگیا۔ ”اے ہاں..... یاد آیا۔ یا ایک خط تو لکھ دے کسی کے نام، دراصل میری لکھا کی اتنی اچھی نہیں ہے اور سنا ہے بلڑکیوں پر اچھی لکھا کی کا بڑا اثر ہوتا ہے۔“ کوئی اور وقت ہوتا تو میں شاید ماجد کو مال دیتا، کیوں کہ ہر نفعے کسی نہ کسی کے قدموں میں پیچھنے کے لیے ماجد کو ایسے خط اور رقصوں کی ضرورت پڑتی رہتی تھی، مگر اس وقت چوں کہ ٹیوٹن کا وقت نکلا جا رہا تھا، اس لیے میں نے بادل بخو است چند سطور ایک سادے صفحے پر کھینچ کر ماجد کے حوالے کر دیں۔ وصول کرنے والی کا نام اس نے نہیں لکھوایا اور اپنے نام کی جگہ بھی خالی رہنے دی تاکہ وہ اپنے ”مٹا ٹکن“ دھمکا کر سکے۔ میں جیسے جیسے جان ٹھنڈا کرناہید کے گھر کے دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ آج مرزا صاحب بھی گھر میں موجود تھے اور مچھن میں بیٹھے حد گڑ گڑا رہے تھے۔ ہماری پڑھائی کے دوران وہ بھی وقتاً فوقتاً لقمے دیتے رہے اور کچھ جگہ میری تصحیح بھی کی۔ اب انہیں کوئی بتانا کچھ بوش مندوں کے لیے ہوتی ہے۔ مدہوش بھلا یہ درست اور غلط کی تکرار کیا جائیں۔ ناہید کی باتوں سے اس دن میں نے اندازہ لگایا کہ اسے شعرو شاعری سے کافی لگاؤ ہے اور اسے بہت سے اچھے شعری زبان یاد ہیں۔ مگر میرے ساتھ ایک بہت عجیب سا مسئلہ یہ تھا کہ میں دن بھر شام کے چار بجنے کا انتظار کرتا رہتا۔ بلکہ کئی بار کائناتوں پر کاٹ کر گزارا کرتا، مگر جیسے ناہید میرے سامنے آتی اور اس کے خُسن کے ٹور کی پہلی کرن میری آنکھوں پر پڑتی، میری نظریں خود بخود جھٹک جاتیں۔ مجھے ناہید کے گھر ٹیوٹن پڑھانے جاتے ہوئے سات آٹھ روز ہو چکے تھے اور ان دنوں میں، میں نے شاید سات بلکہ سات کے لیے بھی اس کے چہرے کو براہ راست نظر بھر کر نہیں دیکھا تھا۔ بس اس کے ہاتھ، ٹانگن، چوڑیوں کی کھٹکناٹ، آواز کا زبردیوم، بالوں کی وہ ایک لمبی سی شریر لٹ، جو بار بار چہرے سے نیچے ڈھلک کر اسے تنگ کرتی رہتی تھی، اس کی خردلی انگلیاں اور اس کا وہ قلم پکڑنے کا ایک خاص انداز۔ بس یہی کچھ انہوں کا سرمایہ تھا۔ ہاں البتہ ایک فائدہ مجھے یہ ضرور ہوا تھا کہ ناہید کو ارد پڑھانے کے چکر میں، نہیں خود دن بھر اردو کے رٹے لگاتا رہتا اور اپنے اردو کے استادوں سے اس روز کی ٹیوٹن کے باب بھی خوب اچھی طرح سمجھ کر آتا تھا کہ مجھ سے کوئی غلطی نہ ہو جائے، سو اس مشق سے میری اپنی دسویں کی اردو کی تیاری بہت اچھی ہوتی گئی۔

میرے میٹرک کے امتحانات قریب آ رہے تھے۔ اسکول کی طرف سے دسویں جماعت کو شہر کے مقامی سینما میں اردو فلم دکھانے کے لیے لے جایا گیا۔ ہیرو ہیرو پر بیٹھا ایک محفل میں ہیروئن کو اپنے دل کا حال سنارہا تھا۔ سفید لباس میں ملیوں وہ ہیرو، پیانو بجاتے ہوئے مجھے بہت اچھا لگا اور جانے کیوں اسی لمحے میرے اندر دھمی پیانو سیکھنے اور بجانے کی خواہش، ایک شدید تک کی صورت میں جاگ اٹھی۔ اس رات میں نے خود کو خواب میں وہی سفید سوٹ پہنے پیانو بجاتے دیکھا اور ناہید اسی فلم کی ہیروئن کی طرح پیانو کے پہلو سے ٹوٹی میرے قریب کھڑی ہوئی۔ میری دھن سن رہی تھی۔ عجیب بات یہ تھی کہ خواب میں میرا چہرہ اور وجود کسی بھی قسم کے داغ دھبوں اور سیاسی سے بالکل پاک صاف تھا۔ صبح جب اچانک کسی کھٹکے سے میری آنکھ کھل گئی تو بہت دیر تک میں نے صدمے کے مارے آنکھیں میچے رکھیں۔ کچھ خواب کتنے اثر انگیز اور روح تک میں سراپت کر جانے والے ہوتے ہیں کہ بہت دن تک میںیں اُداس اور بے چین رہ سکتے ہیں۔ تب تمارا جی چاہتا ہے کہ کاش ہماری موجودہ زندگی ایک خواب ہوتی اور وہ خواب ہماری زندگی سے بدل جاتے، مگر کچھ لوگوں کے خواب، سدا خواب ہی رہتے ہیں۔ میں بھی ان ہی میں سے ایک تھا۔

ناہید کو ٹیوٹن پڑھاتے ہوئے مہینہ بھر ہونے کو آیا تھا۔ میرے نہ چاہتے ہوئے بھی اس کا کورس تقریباً ختم ہونے کو تھا، بلکہ مرزا صاحب نے قواب بننے میں صرف تین دن ٹیوٹن اور تین دن خود ناہید کی اپنی دھڑائی کے لیے مقرر کر دیے تھے۔ میری بے چینی بڑھتی جا رہی تھی، کیوں کہ میں جانتا تھا کہ چند دن بعد یہ تین دن کی ملاقات بھی ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائے گی۔ اس تمام عرصے میں ناہید نے مجھ سے کبھی کورس کی کتابوں اور اپنی ٹیوٹن کے ہوم ورک کے علاوہ کوئی بات نہیں کی تھی، مگر پھر بھی نہ جانے کیوں مجھے ایسا لگتا تھا کہ ہم دونوں اُس ایک گھنٹے میں زمانے بھر کی باتیں کرتے ہیں۔ شاید خُسن کی اپنی کوئی گفتگو، کوئی بولی ہوتی ہے، جسے عام لفظوں یا زبان کی ضرورت نہیں ہوتی۔ یا شاید خوب صورتی کا احساس ہی اپنے اندر سارے جہاں کی گفتگو سمونے رکھتا ہے۔ وہ کہتے ہیں ناں، تجھے یہ باتوں میں، گفتگو اضافی ہے۔ میں ناہید کے گھر سے نکلنے کے بعد بھی اسی تجھے میں مقید رہتا۔

اُس رات بھی میں اپنے کمرے میں گود میں کتاب رکھے اپنے آپ سے اسی گفتگو میں مصروف تھا کہ اچانک باہر گلی میں ایک شور سا اٹھا، جیسے بہت سے لوگ کسی کا پیچھے چلا تے پیچھا کر رہے ہیں۔ میں گھبرا کر کمرے سے باہر نکلا اور چھت سے نیچے گلی میں جھانکا تو عجیب سا شور مچا ہوا تھا۔ جلدی سے نیچے اتر کر معلومات کیں، تو بھانت بھانت کی باتیں سن کر میرے تو ہوش ہی اڑ گئے۔ گلی میں چند بزرگ سرگوشیوں میں باتیں کر رہے تھے۔ ”نہ میاں..... کوئی کسی کی چھت پر فوجی نہیں تپا۔ ضرور دلاڑی کی طرف سے کوئی اشارہ ہوگا۔“ دوسرے صاحب منمنائے۔ ”ہاں بھی، یہ آج کل کی نئی نسل بھلا بڑوں کی عزت اور غیرت کیا جانے۔“ چلا چلا کر مرزا صاحب کے گھر والے خاندان کی کسی تقریب سے واپسی پر لیٹ ہو گئے تھے۔ گھر میں صرف ناہید اور اس کا چھوٹا بھائی تھا۔ کسی پڑوسی نے اُن کے چھت پر کسی کو کورتے دیکھا تو شور مچا دیا۔ سایہ شناخت ہوئے بنا فرار ہونے میں کامیاب ہو چکا تھا، مگر اپنے پیچھے افواہوں اور بد نامیوں کا ایک سیلاب چھوڑ گیا تھا۔ مجھے ان سب پر بہت غصہ آیا کہ وہ ناہید جیسی شریف اور باکردار دلاڑی پر ایسے الزامات لگا رہے تھے۔ اگلے دن بھی محلے میں یہی چرچا رہا۔ دن کے تقریباً دو بجے کے قریب کسی نے ہمارے گھر کا دروازہ بے تھا شاید شروع کر دیا۔ سب سے پہلے ابائی اور پھر ان کے پیچھے دونوں بڑے بھائی بھی گھر سے باہر نکلے، باہر سے مرزا صاحب کے شور شرابے کی آواز آ رہی تھی۔ میں بھی سن گن لینے کے لیے دروازے تک پہنچا ہی تھا کہ باہر محلے داروں کی بھیڑ میں کھڑے مرزا صاحب غصے اور نفرت سے چلائے۔ ”یہ رہا..... یہاں گھر میں ٹھپا بیٹھا ہے۔ جیسی اس کی شکل مکروہ ہے، ویسے ہی گھٹاؤ نے کروت ہیں اس کلوے کے۔“ میں نے حیرت سے گھبرا کر ان سب کی طرف دیکھا۔ ”جی.....؟ مگر میں نے کیا کیا ہے؟“ ”کیا کیا ہے تم نے؟“ خوب..... ابھی بتاتا ہوں۔“ انہوں نے جیب سے ایک کاغذ نکال کر سب کے سامنے لہرایا۔ ”اب یہ نہ کہنا کہ یہ خط تم نے نہیں لکھا۔ تمہاری تحریر خوب پچھانا ہوں میں لکھتے۔“ میں نے پہلی نظریں میں ماجد کے لیے لکھا پنا خط پہچان لیا اور میری زبان سے حیرت میں بے ساختہ نکلا۔ ”ہاں..... مگر یہ خط تو میں نے۔“ مگر میری بات ادھوری ہی رہ گئی اور مرزا صاحب کا ہاتھ تیزی سے گھوما اور میرے گال پر ایک زحمت نے دار چاٹا پڑ گیا۔

(جاری ہے)

بائیں ہم ندیم نوجوان نسل کے پسندیدہ منٹک کے معروف و منفرد رامارائز، ناول نگار ہیں۔ ان کے ناول ”خدا اور محبت“ اور ”بچپن کا دبسمز“ نے بین الاقوامی پذیرائی حاصل کی، تو جنگ، سنڈے میگزین میں شائع ہونے والے ناول ”عبداللہ“ کو بھی وقت کے پسندیدہ ترین ناول کا درجہ حاصل ہوا۔ انہیں ان کی ادبی خدمات پر حکومت پاکستان نے تین مرتبہ قلم کار کرڈی سے نوازا۔ نیز قلم کے شعبے میں ”عبداللہ“ نامی ایک بین الاقوامی فلم کے تخلیق کار کی حیثیت سے بھی قدم رکھ چکے ہیں۔

”پری زائ“ ایک اچھوتے، حساس اور قدرے مشکل موضوع پر مبنی بہت دل گداز سی تحریر ہے، یہ ایک ایسے شخص کی کھاپ ہے، جسے اک کم صورتی کے عیب کے سبب، اس ظاہر پسند و زبردست دنیا کے آن گنت بد صورت رویوں، بد ہیئت آئینوں کا سامنا کرنا پڑا۔ ناول سے متعلق اپنی آراء سے آگاہ کرنا مرکز مت بھولے گا۔ ہمارا پتا وہی پرانا ہے:

ایڈیٹر ”سنڈے میگزین“ رونا تہ جگ، شعبہ میگزین، اخبار منزل، آئی آئی چندر نگر روڈ، کراچی۔ ای میل:

sundaymagazine@janggroup.com.pk

سنڈے میں اس زوردار تھپڑ کی آواز ایسے گونگی، جیسے ہم دھماکا ہوا ہو، مگر آواز کے دھماکے سے کہیں زیادہ گونج میرے اندر بہت کچھ ٹوٹ جانے کی تھی۔ مرزا صاحب نے اس طمانچے کے بعد مجھے کچھ کہنے کا موقع ہی نہیں دیا اور چیخ چیخ کر مجھے گوتانے لگے کہ گزشتہ رات ان کی چھت پر کوئی اور نہیں، میں کو دھتا اور اس بات کی خبر ناہید کی امی کو صبح سویرے اُس وقت ہوئی، جب وہ چھت پر کپڑے ڈالنے لگیں اور انہیں وہاں ایک کونے میں میرا لکھا ہوا یہ خط مڑا تڑا سا پڑا ہوا ملا۔ وہ سب گھروالے میری تحریر اچھی طرح پہچانتے تھے، کیوں کہ ناہید کا اردو کا درجہ میری تحریر سے بھرا پڑا تھا۔ سارے محلے دار مجھے لعنت ملا مت کرنے لگے۔ میرا بس نہیں چل رہا تھا کہ کسی طرح زمین شق ہو اور میں اس میں سما جاؤں۔ مرزا صاحب کے بھاری تھپڑ کے نشان تو اگلے تین دن میں دھیرے دھیرے گال سے مدھم پڑنے لگے، مگر روح پر تلے تھپڑ کے داغ پھر پھر مندل نہ ہو پائے۔ بھیڑ کے چھتے ہی ابا اور بڑے بھائی مجھے گردن سے پکڑ کر کھینچے ہوئے اندر جھن میں لے آئے اور پھر جس کے ہاتھ جو آیا، اس نے اسی سے میرے جسم پر سیاہ نیل ڈال دیے۔ بدن پر چوٹ کے نشان ینگلوں ہوں تو انہیں نیل کہا جاتا ہے، مگر جب گھائل کا پورا جسم سیاہ پڑ جائے تو اسے کیا کہا جائے۔ میں نے بہت کوشش کی کہ انہیں بتا سکوں کہ وہ خط میری تحریر میں ضرور تھا، مگر میرا نہیں تھا، مگر کسی نے میری ایک نہ سنی۔ ”اچھا۔۔۔ تو یہ تھی تمہاری ٹیڈن۔۔۔ خوب عزت افزائی کروائی ہے آج ہماری، ڈوب مرو شرم سے۔۔۔ عشق لڑانے سے پہلے اپنی شکل تو آئینے میں دیکھ لیتی تھی۔“ جسم پر چوٹ کے ساتھ، روح پر بید کی طرح پڑنے والا اک اک طعنہ بھی کسی تازیانے کی طرح لگتا تھا۔

بہت روز تک تو میں شرم کے مارے چھت والے کمرے ہی سے باہر نہیں نکلا۔ سارے گھروالوں نے تقریباً میرا پانچٹک کر رکھا تھا۔ میں دن بھر کمرے میں بیٹھا سوچتا رہتا کہ آخر ماہد کو یا گیا اور قعد ناہید کی چھت سے کیسے برآمد ہوا۔ جانے ناہید میرے بارے میں کیا سوچتی ہوگی، اسے بھی تو باقی سب لوگوں کی طرح یہی لگا ہوگا کہ میں اسے یہ عشقیہ خط دینے کے لیے رات کو اس کی چھت ٹاپا تھا۔ مجھے کچھ نہیں آ رہا تھا کہ کس طرح ناہید تک اپنے دل کی بات پہنچاؤں کہ مجھے اپنی شکل اور اپنی اوقات کا اچھی طرح سے اندازہ ہے اور میں کبھی ایسی گستاخی کا سوچ بھی نہیں سکتا۔ میرے دل میں اس کے لیے جو بھی تھا، وہ ہمیشہ کے لیے میرے دل کے کسی تازک گوشے میں پنہاں رہنے کے لیے تھا۔ چپاری کی پو جا کسی صلے کی تمنا کے لیے تو نہیں ہوتی۔ پروانے کو شمع سے موسم کا دان کب چاہیے ہوتا ہے، اسے تو بس جل جانا ہوتا ہے، مجھے بھی صرف جلنے سے واسطہ تھا، روشنی کس کے حصے میں آئے، اس سے بھلا مجھے کیا غرض تھی۔ دوسروں کے امتحانات میں نے بوجھل دل اور اچھے ہوئے دماغ کے ساتھ دیے اور بہ مشکل سینکڑ ڈیڑھن میں پاس ہوا۔ بڑی مشکل سے ابا سے کالج میں داخلے کی اجازت ملی۔ وہ بھی اس شرط پر کہ اپنی کتابوں اور کالج کی فیس کا خرچہ میں خود برداشت کروں گا۔ میں نے سوچ رکھا تھا کہ کالج کے بعد شام کو کوئی چھوٹی موٹی نوکری یا کسی دکان پر کام پکڑ لوں گا۔ اس لیے کالج میں داخلے کی کوشش کے ساتھ ساتھ، دن بھر شہر کے چھوٹے موٹے ہوٹلوں اور ریٹیلر بس بکس وغیرہ پر کام ڈھونڈنے کے لیے بھٹکتا رہتا۔

ایسے ہی ایک دن میں کام ڈھونڈنے شہر کے پارسی ہوٹلوں والی سڑک پر نکلا تو ایک لمبے کو یوں لگا، جیسے آنکھوں کا دھوکا ہوا ہے۔ میں نے آنکھیں مل کر غور سے دیکھا، تو وہ واقعی ناہید ہی تھی، شاید اسکول کی چھٹی کے بعد کسی کے ساتھ اس ریٹوئرنٹ میں چائے پینے آئی تھی۔ ناہید اب دوسروں جماعت کی طالبہ تھی، اور اس علاقے میں اسکول یا کالج کی طالبات کا گروپ کی شکل میں چائے پینے یا ریک میں سو سے چٹنی کی پلیٹ اڑانے کے لیے آنا معمول کی بات تھی۔ میرا دل زور سے دھڑکا، شاید آج ہی وہ موقع تھا، جب میں ناہید سے مل کر اس کی غلط فہمی دور کر سکتا تھا۔ مگر جانے اس کے ساتھ اور کون کون ہوں، اور اگر ناہید نے برا مانا یا اور غصہ کیا تو پھر.....؟ ایک اور قماش نہ کھڑا ہو جائے۔ پھر تو میرے ابا کے ہاتھوں میرا خون ہونا لازمی تھا، مگر میرے پاس اور چارہ بھی کیا تھا۔ جانے پھر وہ بارہ ناہید سے زندگی بھر اس طرح آسنا سامنا ہو پائے یا نہیں۔ مجھے ایک کوشش تو ضرور کرنی چاہیے، آخر ناہید نے خود بھی تو ہمیں بھر مجھ سے پڑھا ہے۔ میرے بارے میں کچھ اندازہ تو اس نے بھی لگایا ہوگا، میں نے تو کبھی نظر بھر کر بھی اس کی طرف نہیں دیکھا۔ میں اپنے آپ ہی سے لڑتا، خود ہی فیصلے کر کے انہیں روک رہا ہوں پھر اپنے اندر کی جنگ سے گھبرا کر مزید کچھ سوچے بنا کیے کی طرف قدم بڑھا دیے۔ اندر بہت رش تھا، نہیں پریشان لگا ہوں سے اسے چاروں طرف کھوج رہا تھا، اور پھر..... وہ مجھے ایک کیمپن کے پردے کی اوٹ میں بیٹھی دکھائی دے گئی۔ کچھ اطمینان ہوا کہ چلو اس کے ساتھ زیادہ بھیڑ نہیں ہے، بات کرنے میں آسانی ہوگی سو، دھڑکتے دل کے ساتھ ساتھ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا کیمپن کے پاس کھینچ گیا۔ میرا کچھ دیر پہلے



ہی چائے کے کپ میز پر سجا کر واپس پلٹا تھا۔ ناہید کسی سے بات کر رہی تھی اور اس کے سر پر اس کی سیاہ چادر ہمیشہ کی طرح سلیقے سے لگی ہوئی تھی۔ میں نے دل کڑا کر کے زور سے کھلا کر اپنی موجودگی کا احساس دلایا اور دھیرے سے سلام کیا۔ اس کی کھلی ابھی تک پردے کی اوٹ میں تھی۔ ناہید نے چونک کر میری طرف دیکھا اور پھر، جیسے اس کے چہرے کا رنگ اڑ سا گیا۔ میں نے قدم آگے بڑھایا کہ میرا مقصد اس کی بدنامی نہیں ہے۔ میں تو صرف اس کی غلط فہمی دور کرنا چاہتا ہوں، مگر کہیں میں بیٹھے دوسرے شخص کو دیکھتے ہی خود میرے حواس یک دم متزلزل ہو گئے۔ ناہید کے سامنے کوئی اور نہیں، ماجد بیٹھا تھا۔ وہی ماجد، جس نے مجھ سے ناہید کے لیے رفقہ لکھوایا تھا۔ ماجد بھی بگل بگل کر کے لیے گھبرا گیا۔ میں تیزی سے واپس پلٹا اور کیفے سے باہر آ گیا۔ ماجد میرے پیچھے دوڑتا ہوا باہر تک آیا اور زبردستی راستے میں حائل ہو کر معذرت کرنے لگا۔ ”معاف کر دے یار پری..... میں خود تجھے بتانا چاہتا تھا مگر ناہید نے منع کر دیا کہ فی الحال معاملہ گرم ہے۔ ذرا بات ٹھنڈی ہو جائے تو پھر..... مگر تو نے بھی بڑا تر دوں والا کام کیا۔ تیرے ساتھ جو کچھ بھی ہوا تو نے آخر تک زبان نہیں کھولی۔“ میرا سر تیزی سے پکرا رہا تھا۔ ناہید جانتی تھی کہ اس کی چھت پر اُس رات ماجد کو دھکا تھا، پھر بھی اس نے اپنے گھر والوں سے یہ بات نہ پھپھائے رکھی۔ مجھے میرے گھر، محلے والوں کے سامنے اتنا رسوا کیا، سارے زمانے میں میرا تماشا بنا دیا۔ میرا سر گھوم رہا تھا، میں نے یہ مشکل ماجد سے سوال کیا۔ ”تو کیا وہ خط تم نے ناہید ہی کے لیے لکھوایا تھا؟“ ”ہاں یار! اُسی کو دینا تھا۔ ایک دن اس نے میرے سامنے تمہاری لکھائی کی تعریف کی، تو میں نے بھی اس سے شرط لگائی کہ تمہارے ہی ہاتھ سے خط لکھوا کر اُسے دوں گا۔“ میں نے حیرت سے ماجد کو دیکھا۔ ”مگر تم تو ہر وقت یہی کہتے تھے کہ وہ جنہیں کبھی گھاس تک نہیں ڈالتی.....“ ماجد نے ڈھکیا کر قہقہہ لگایا۔ ”وہ سب بھی نہیں ناہید کے کہنے ہی پہ کہتا تھا، تو نہیں جانتا یار۔ یہ لڑکیاں ہم بے وقوف لڑکوں سے کہیں زیادہ تیز ہوتی ہیں۔ بڑا داغ چلتا ہے، ان کا ایسے معاملات میں، دراصل وہ کسی بھی طرح کی بدنامی مول نہیں لینا چاہتی تھی۔ آج بھی بڑی مشکل سے اسے چائے کے ایک کپ کے لیے راضی کیا تھا۔ پڑو نے آکر سارا معاملہ بگاڑ دیا۔“ میرا ذہن سا کہیں سا کہیں گھبرا رہا تھا۔ ماجد اپنی دھن میں نہ جانے کیا کچھ بولتا رہا۔ اتنے میں کیفے کا ایک ایریا باہر آیا اور ماجد سے بولا۔ ”آپ کو اندر بارہا رہی ہیں۔ کبھی ہیں، مہمان کو بھی ساتھ لے آئیں، ضروری بات کرنی ہے۔“ میں نے لاکھ دامن چھڑانے کی کوشش کی، مگر ماجد مجھے تقریباً کھینچتا ہوا اندر کیفے میں لے گیا۔ ناہید سر جھکائے بیٹھی تھی۔ مجھے اندر آتے دیکھ کر دھیرے سے بولی۔ ”امید ہے آپ نے ہم دونوں کو معاف کر دیا ہو گا۔ ہم دونوں کی وجہ سے آپ کو جو تکلیف پہنچی، ہم اس کے لیے معذرت خواہ ہیں۔ میں خود آپ سے مل کر آپ کو ساری بات بتانا چاہتی تھی، مگر حالات ایسے بگڑے کہ میں کچھ نہ کر سکی۔“ میں چپ چاپ بیٹھا اس کی بات سنتا رہا۔ اس سے یہ بھی نہ کہہ سکا کہ کم از کم مجھے توجہ دیا جاتی۔ ناہید نے اپنی بات جاری رکھی۔ ”دراصل میں چاہتی تھی کہ جب تک ماجد کے گھر سے میرے لیے باقاعدہ رشتہ نہیں آ جاتا، جب تک کسی کو بھی ہمارے بارے میں ذرا سا بھی شک نہ ہو۔ آپ تو ابائی کے غصے سے واقف ہیں ناں۔ اس رات بھی ماجد کی ایک ڈرامائی غلطی سے یہ سارا بنگلہ کھڑا ہو گیا اور میں چاہی نہیں چلا کہ آپ کا کھانا اور رقعہ کب اور کیسے گھبراہٹ میں وہیں گر گیا۔“ ناہید کچھ دیر کے لیے خاموش ہو گئی۔ کچھ لوگ جب بولتے بولتے خاموش ہو جاتے تو ان کی خاموشی بولنے لگتی ہے۔ مگر مجھے آج اس کی یہ خاموشی بہت گراں گزر رہی تھی۔ ”دراصل میں بہت ڈر گئی تھی، اسی لیے جب اتانے آپ کی تحریر دیکھ کر آپ پر شک کیا، تو میں چپ رہی۔ کیوں کہ میں اگر ماجد یا کسی اور کا نام لیتی تو انہیں مجھ پر بھی شک ہو سکتا تھا کہ میں بھی اس کے ساتھ شامل ہوں، صرف ایک آپ ہی ایسے تھے، جن کے نام کے ساتھ میرا نام نہیں جوڑا جاسکتا تھا۔ مطلب کسی کو بھی مجھ پر شک نہیں ہو سکتا تھا کہ میں بھی آپ کو پسند کر سکتی ہوں۔“ میں نے نظریں اٹھا کر اسے دیکھا اور وہ بولتے بولتے چپ ہو گئی۔ میرے اندر بہ یک وقت کی تششے پکھتا رہے اور میں نگلے پاؤں ان کمرچوں پر چلتا ہوا وہاں سے اٹھ آیا۔

پتا نہیں، میں نے اُس روز گھر تک کاراستہ کیسے طے کیا۔ میرے آس پاس میوزک ٹیک کا شور، گاڑیوں کے ہارن اور لوگوں کی آوازوں کی بھرمار تھی، مگر میں جیسے ساری دنیا سے لعلق اور بیگانہ انسان راستوں پر چلتا رہا، شاید ہمارے قدم کچھ راستوں پر چل چل کر اتنے راستہ آشنا ہو چکے ہوتے ہیں کہ دل اور دماغ بند ہونے کی صورت میں بھی وہ ہر موڑ پہچان لیتے ہیں، ورنہ اس وقت میری جو حالت تھی مجھے ضرور کسی دیرانے میں بھٹک جانا چاہیے تھا، بھٹک ہی تو کہہ رہی تھی وہ..... کوئی اندھا ہی ہو گا جو ناہید پر مجھ سے کوئی بھی تعلق جوڑنے کا شک کرے گا۔ کہاں وہ اور کہاں میں؟ اس نے کتنی آسانی سے یہ بات کہہ دی۔ بعض حقائق ہم پر پہلے دن ہی سے روز روشن کی طرح عیاں ہوتے ہیں، مگر پھر بھی کسی کی زبان سے ان کی تشریح ہمیں کس قدر سوگوار کر دیتی ہے، ہم کم زور انسان اپنے اندر اتنی خود فریبیاں کیوں پالے رکھتے ہیں؟ شاید اسی لیے انسان اپنی پیدائش سے لے موت تک جانے نشئی بارٹو تھا ہے مگر ناہید کی پسند ماجد بھی کیسے ہو سکتا ہے۔ محلہ ماجد کے قتلوں سے واقف تھا، مگر پھر بھی ناہید.....؟ میرا ذہن سُن ہو گیا تھا۔ مطلب یہ ہوا انسان کی ظاہری شخصیت ہی آخر کار فتح یاب ہوتی ہے۔ یہ اندر کی خوب صورتی، دل کی سچائی وغیرہ جیسی فضول کتابی باتیں ہمیشہ کی طرح ایک بار پھر بیکسر غلط ثابت ہو گئی تھیں۔ شاید یہ ساری کتابی کھرا مجھ جیسے پری زادوں کی تسلی کے لیے ہی تھی۔

میرا داخلہ ایک سرکاری کالج میں ہو چکا تھا، مگر دل کالج جانے پر آمادہ ہی نہیں ہو رہا تھا۔ دسویں جماعت تک ایک ہی اسکول میں پڑھتے پڑھتے سارے استاد اور طالب علم میرے نام اور صورت کے تضاد کے عادی ہو چکے تھے اور انہوں نے میری بد صورتی کو کسی حد تک قبول کر لیا تھا، مگر کالج جاتے ہی یہ ساری بحث ایک بار پھر سے تازہ ہو گئی۔ بہت دنوں تک کلاس میں، کینیٹن میں اور کالج کی راہ داریوں میں مجھے جھرے سے اس تجربے سے گزرنا پڑا، وہی طرز بھری مسکراہٹ، جیسے اور حضرات بھری مثالیں۔ میرا جواب ہمیشہ کی طرح خاموشی ہی تھا، کیوں کہ میں جانتا تھا کہ مجھے اس چھٹی سے بار بار چھٹنا ہو گا۔ ان ہی دنوں میری ملاقات نورتھ ایئر کے ناساز سے ہوئی۔ دراصل اس سے پہلا تعارف بھی اس کے اس عجیب و غریب تقصیر کی وجہ سے ہوا تھا۔ اس کا پورا نام جمیل احمد تھا، مگر وہ خود کو ناساز کہلوانا پسند کرتا تھا۔ ایک دن میں راہ داری سے گزر رہا تھا کہ کسی سینئر طالب علم نے زور سے اس کا نام پکارا۔ ”اے او

ناماز..... میری پھر سے تین سہیلیاں آتی ہیں۔ مطلب تو اگلے سال بھی اسی کالج کے لنگر کی روٹیاں توڑے گا۔ ناماز کے باقی دوست بھی بس پڑے۔ ناماز نے ہاتھ میں بکڑے سگریٹ کی راکھ جھاڑی اور ایک بھر پور کش لے کر دھواں فضا میں اڑا دیا۔ ”وہ طفل کیا کریں گے جو گھٹنوں کے بل چلے۔“ پتا چلا کہ گزشتہ تین چار سال سے ناماز چوتھے سال ہی میں انکا ہوا ہے۔ نہ اسے پاس ہونے کی جلدی تھی، نہ ہی کالج والے اسے نکالنے پر آمادہ کیوں کر وہ کالج کی ادنیٰ سوسائٹی کا صدر تھا اور اس کی صدارت میں کالج بہت سی ٹرامیاں اور کپ جیت چکا تھا۔ وہ ایک بہترین مقرر، شاعر اور افسانہ نگار تھا۔ اگلی صبح میں کالج کے گیٹ سے اندر داخل ہوا تو ناماز گیٹ کے قریب ہی بے چینی سے ٹہل رہا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی اس نے اشارے سے اپنے قریب بلایا۔ ”بات سنو لڑکے۔“ میں جھجکتا ہوا اس کے قریب پہنچا۔ ”سگریٹ پیتے ہو؟“ میں نے انکار میں سر ہلایا۔ وہ بے زاری سے بولا۔ ”پھر کیا خاک جیتے ہو۔“ میری جیب میں اس وقت شام کی ٹیوشن سے ملنے والے چند روپے پڑے تھے۔ میں سیدھا وہاں سے کینٹین گیا اور سب سے بہتر برانڈ کی ایک ڈیٹا اور ماچس لے کر وہ بارہ ناماز کے پاس آیا اور سگریٹ اور ماچس اس کی پھٹی پر رکھ دیے۔ وہ سگریٹ دیکھ کر چونک سا گیا۔ اس نے جلدی سے سگریٹ ساگ کر چار بھر پور کش لگائے اور میں نے پہلی مرتبہ کوئٹن کو اپنے سامنے بیٹھے شخص کی رگوں میں پوری طرح سرایت ہوتے ہوئے محسوس کیا۔ اس نے مزید چند کش لیے تو میں پلٹ کر جانے لگا۔ ناماز نے جلدی سے مجھے آواز دے کر روکا اور غور سے دیکھتے ہوئے بولا۔ ”پیسے تھے تمہارے پاس۔؟“ ”ہاں! کرائے کے پیسے تھے، جو آج تمہارے کام آگئے۔“ وہ زور سے ہنسا اور ہاتھ بڑھا کر بولا۔ ”مجھے ناماز کہتے ہیں۔ میں اپنا جھگڑا ناماز رکھنا چاہتا تھا، مگر پتا چلا کہ میرے حق پر پہلے ہی کوئی موسیقار ڈاکا ڈال گیا ہے۔ تمہارا نام کیا ہے۔؟“ میں نے انکے ہوئے اپنا نام بتایا۔ ”پری زاد!“ ناماز نے زور سے ”واہ“ کہا۔ ”تو بڑا شاعر اندر رکھا ہے پیارے۔۔۔۔۔ زندگی میں پہلی مرتبہ مجھے کسی کے لہجہ اور نظر میں اپنا نام سن کر مطلقاً خوشی محسوس ہوئی۔ یہ میری اور ناماز کی دوستی کی ابتدا تھی۔ میری زندگی کا پہلا دوست، جس سے بات کرتے ہوئے میری زبان لڑکھائی نہیں تھی، نہ ہی مجھے خندے پسینے آتے تھے۔ سگریٹ اس کی زندگی کا ایک ایسا لازمی جزو تھا کہ کبھی کبھی مجھے یوں محسوس ہونے لگتا جیسے ناماز سگریٹ کو نہیں، سگریٹ دھیرے دھیرے ناماز کو پی رہی ہو، نگل رہی ہو۔ وہ مجھ سے عمر میں پانچ چھ سال ہی بڑا تھا، مگر اپنی باتوں سے کوئی بوڑھی روح دکھائی دیتا تھا۔

چند ہفتوں بعد شعر کے تمام مردانہ اور زنانہ کالجوں کے درمیان تقریری مقابلے ہوئے تو ناماز کا چادو سر چڑھ کر بولے لگا۔ میں ایسی تقریبات میں جانے سے حتیٰ الامکان گریز کرتا تھا، مگر وہ فاضل مقابلے کی تقریب میں مجھے کسی طرح زبردستی پکڑ کر لے گیا۔ ہال میں ایک جانب ہمارے کالج کے لڑکوں کی نشستیں تھیں اور دوسری جانب لڑکیوں کے کالج کی طالبات بیٹھی اپنی کالج کی مقررات کی حوصلہ افزائی کے لیے شور مچا رہی تھیں۔ میں ایک کونے میں سکر کر بیٹھا رہا، ناماز نے اپنی دھواں دار تقریروں سے ماحول گرم کر دیا، مگر نہ جانے آخری مرحلے پر وہ پوچھا کیوں ہو گیا اور لڑکی نے پہلا انعام جیت لیا۔ میں نے باہر نکلتے ہی اس سے براہ راست اپنے اس خدشے کا اظہار کر دیا کہ وہ جان بوجھ کر ہار رہا ہے۔ ناماز دھیرے سے مسکرایا۔ ”تم اگر دھیان سے دیکھتے تو تمہیں پتا چلتا کہ میں جیت گیا ہوں۔ زندگی میں ہر بازی اول اور دوم نمبر سے نہیں ٹاپی جاتی۔“ پھر اس نے مجھے غور سے دیکھا۔ ”تم نے کبھی کسی سے محبت کی ہے پری زاد۔؟“ ”پہلے بھر کے لیے مجھے یوں محسوس ہوا کہ ناماز بھی باقی سب لوگوں کی طرح میرا مذاق اڑا رہا ہے مگر مجھے اس کی آنکھوں میں اس کے وال کی چھائی دکھائی دی۔ میں نے مر جھکا کر دھیرے سے جواب دیا۔ ”مجھ سے بھلا کون محبت کرے گی۔؟“ ”کیوں۔۔۔۔۔ تم سے محبت کیوں نہیں کی جاسکتی۔؟“ میں چپ رہا۔ ناماز سمجھ گیا اور بات بدل کر بولا۔ ”شاعری پڑھتے ہو۔؟“ ”ہاں، مگر مجھے شعر یاد نہیں رہتے۔“ ناماز نے تصحیت کی۔ ”شعر یاد رکھا کرو، صنفِ نازک پر بڑا اچھا اثر پڑتا ہے اچھے شعروں کا۔“ پھر کچھ سوچ کر بولا۔ ”ضمیر نازی کو پڑھا کرو۔ اور اس کی ایک نظم تو زبانی یاد کر لو۔“ ہمیشہ دیر کر دیتا ہوں میں۔۔۔۔۔ ضروری بات کہنی ہو۔۔۔۔۔ کوئی وعدہ بھانا ہو، اسے آواز دینی ہو۔۔۔۔۔ اسے واپس بلانا ہو۔۔۔۔۔ ہمیشہ دیر کر دیتا ہوں میں۔۔۔۔۔ کسی کو موت سے پہلے۔۔۔۔۔ کسی غم سے بچانا ہو۔۔۔۔۔ حقیقت اور حقیقتی کچھ، اس کو چاکر جاتا ہو۔۔۔۔۔ ہمیشہ دیر کر دیتا ہوں میں۔۔۔۔۔ میں نے جلدی جلدی ساری نظم اپنی کاپی میں نوٹ کر لی اور اسی وقت اس کا رائج بھی لگا لیا۔ ”بس۔۔۔۔۔ اب یاد رکھنا کہ تمہیں اپنی گفتگو کے دوران کسی نہ کسی بہانے یہ نظم دہرائی ہے۔ میں تمہیں چند اور ارائگز غزلیں اور نظمیں بھی یاد کروادوں گا۔ کیا سمجھے۔؟“ میں نے جلدی سے کسی نیچے کی طرح سر ہلایا۔ مجھے یاد آ یا کہ ناہید کو بھی شعرو شاعری سے کافی گہرا لگاؤ تھا اور شاید ناہید کو بھی بہت سے شعر یاد تھے۔ ناہید کا خیال آتے ہی میرے گال پر شدید جلن کا ایک احساس ہوا۔

اگلے چند دنوں میں ناماز نے مجھے بہت سی نظمیں یاد کروادیں اور پھر جس دن میں نے بزمِ ادب کے جریڈ میں کھڑے ہو کر ”محبت اب نہیں دوگی۔۔۔۔۔ یہ کچھ دن بعد میں ہوگی۔ گزر جائیں گے جب یہ دن۔۔۔۔۔ یہ ان کی یاد میں ہوگی“ سنائی تو پہلی مرتبہ کلاس کے لڑکوں کے دل سے میرے لیے تالیاں بجائیں اور استاد نے بھی مجھے زندگی میں پہلی مرتبہ شاباش دی۔ ناماز کی کہی بات سچ ثابت ہو رہی تھی۔ لوگ میری بات غور سے سننے لگے تھے۔ میرے دل میں ایک عجیب سی خواہش انگڑائیاں لینے لگی کہ کبھی کالج میں پہلے کی طرح لڑکے اور لڑکیوں کے اداوار کا مقابلہ ہو اور میں بھی اسٹیج پر جا کر ناماز کی طرح کچھ پڑھوں، میں نے سارے بڑے شعراء کو تقریباً حفظ کر لیا۔۔۔۔۔ اور مجھے کالج کی بزمِ ادب کی ٹیم میں بھی شامل کر لیا گیا تھا۔ اس کوشش میں میرے اندر بھی جھوٹا سا ہی سہی، مگر ایک جھوٹا مونا شاعر پلنے لگا تھا۔ میری باتوں میں شاعری کا رنگ جھلکے لگا۔ ناماز کسی مجھے ہوئے استاد کی طرح میری ”شاعرانہ تربیت“ کر رہا تھا، وہ کہیں سے بھی اچانک نازل ہو جاتا۔ ”یہ کیا غالب اور میر کے کٹے لگاتے رہتے ہو۔ آج کل کی لڑکیاں اتنی مشکل شاعری بھلا کب سمجھتی ہیں۔ احمد فراز کو پڑھا کرو، اور ہاں۔۔۔۔۔ کبھی کبھی ساحر لدھیانوی کو دہرائے میں بھی کوئی حرج نہیں ہے۔ ساحر کو تو جانے ہونا۔۔۔۔۔ میں“ ”پہلے دوپل کا شاعر ہوں۔۔۔۔۔ پہلے دوپل میری کہانی ہے“ دالا۔۔۔۔۔ اور ہاں۔۔۔۔۔ کل سے تمہیں یہ دہراتے رہنا ہے۔“ میں اور میری تنہائی۔۔۔۔۔ اکثر یہ باتیں کرتے ہیں۔ تم ہوتی ہو کیا ہوتا۔ تم اس پر کتنا حیراں ہوتی۔۔۔۔۔ میں دے لفظوں میں ناماز کو یہ سمجھانے کی کوشش کرتا کہ جس کسی ایک کے لیے وہ مجھ سے یہ ساری مشق کر رہا ہے، اس ”ایک“ کا تو میری زندگی میں کوئی وجود ہی نہیں۔ پھر یہ تیاری کس کام کی؟ مگر ناماز بھلا میری کب سنتا تھا۔ ایک دن کالج سے واپسی کے راستے پر وہ میری اسی تربیت میں مصروف تھا کہ میری نظر پرانے کبازے کی دکان کے خیالے شیشے سے اندر پڑی اور میرے قدم وین جم کر رہ گئے۔ اندر ایک پرانا پانو پڑا تھا۔ کبازے نے میری دل چسپی محسوس کی تو جلدی سے بولا۔ ”خالص شیشم کی نگڑی کا ہے۔ انگریز کے پرانے کلب سے خریدا ہے۔ خریدو گے۔ صرف تیرہ ہزار میں دے دوں گا۔“ میں نے اپنی جیب دیکھی، دو سو روپے پڑے تھے، میں نے دھیرے سے کبازے سے کہا۔ ”ایک دن ضرور خریدوں گا۔“ ”ہم دونوں آگے بڑھ گئے۔ میں تھکے ہارے قدموں سے گھر واپس پہنچا تو محسن میں داخل ہوتے ہی ایک جھٹکے سے رک گیا۔ محسن میں ناہید کی امی کھڑی میری اماں سے کچھ بات کر رہی تھیں۔ ان دونوں نے قدموں کی آواز سن کر میری طرف دیکھا۔

(جاری ہے)



باشم ندیم نو جوان نسل کے پسندیدہ، شنگ کے معروف و منفرد ڈراما رائٹر، ناول نگار ہیں۔ ان کے ناول ”خدا اور محبت“ اور ”بچپن کا دبیز“ نے بین الاقوامی پذیرائی حاصل کی، تو جنگ، سندھ، نیگروئن میں شائع ہونے والے ناول ”عبداللہ“ کو کبھی وقت کے پسندیدہ ترین ناول کا درجہ حاصل ہوا۔ انہیں ان کی ادبی خدمات پر حکومت پاکستان نے تمغہ حسن کارکردگی سے نوازا۔ نیز، فلم کے شعبے میں ”عبداللہ“ نامی ایک بین الاقوامی فلم کے تخلیق کار کی حیثیت سے بھی قدر رکھ چکے ہیں۔

”پری زاہد“ ایک اچھوتے، حساس اور قدرے مشکل موضوع پر مبنی بہت دل گداز جی تحریر ہے، یہ ایک ایسے شخص کی کتھا ہے، جسے اک کم صورتی کے عیب کے سبب، اس ظاہر پسند، زر پرست دنیا کے اُن گنت بد صورت رویوں، بد ہیئت آنکھوں کا سامنا کرنا پڑا۔ ناول سے متعلق اپنی آراء سے آگاہ کرنا گزرت ہو لیے گا۔ ہمارا چاہا وہی پرانا ہے:

ایڈیٹر ”سندھ نیگروئن“ روزنامہ جنگ، شعبہ نیگروئن، اخبار منزل، آئی آئی چندر نگر روڈ، کراچی۔ ای میل:

sundaymagazine@janggroup.com.pk

ناہید کی امی نے مجھے دیکھ کر برا سامنہ بنایا اور اماں کو تاکید کرتی ہوئی گھر سے نکل گئیں۔ ”اے بہن آنا ضرور..... ہم لوگ زیادہ عرصے تک ناراضیاں پالنے کے شوقین نہیں۔“ ان کے جانے کے بعد بُرا منہ بنانے کی باری اماں کی تھی۔ ناہید اور ماجد کی بات طے ہو گئی، انہی کی معافی کا پیغام دینے آئی تھی یا شاید یہ جتانے کے لیے کہ تیری اس حرکت کے بعد بھی ان کی لاڈلی کے لیے مجھ کے سب سے بڑے گھر سے رشتہ آیا ہے۔ تُو نے تو ہمیں کہیں کا نہیں چھوڑا پری زاہد.....“ میں اماں کی بڑبڑاہٹ نظر انداز کرتا اوپر کمرے کی جانب بڑھ گیا۔ میں اچھی طرح جانتا تھا کہ ایک دن یہ ہونا ہے، مگر پھر بھی نہ جانے کیوں ناہید کے رشتے کی خبر سن کر دل بھگ سا گیا تھا۔ اگلے روز کالج میں ناساز نے میری یہ کیفیت بھانپ لی۔ ”کیا بات ہے پیارے! آج کچھ مجھے دکھائی دے رہے ہو؟“ میں نے قریب پڑا ننگراٹھا کورڈر تالاب کی طرف پھینکا۔ ”تو اس سے پہلے تم نے مجھے کب جلتے یا جھگڑاتے دیکھا ہے؟“ وہ میرے قریب آ کر بیٹھ گیا۔ ”جل تو رہے ہو اور بڑی شدت سے جل رہے ہو، مگر یہ جل اندری اندر رکھ کر دینے والی ہے۔ ہٹاؤ گے نہیں، کب سے سلگ رہے ہو؟“ میں نے اسے ناہید والی ساری بات بتادی۔ ناساز نے سن کر ایک سردی آدھری، پھر کسی بزرگ کی طرح جینے کر مجھ سے عہد لینے لگا۔ ”تم مجھ سے ایک وعدہ کرو، آج کے بعد اپنے اندر لگی اس آگ کو کبھی بجھنے نہیں دو گے کہ یہ جیون اس من کی مار کے بغیر صرف ایک سرد خانہ، ایک بوجھ ہوتا ہے۔ اس لیے بندے کے اندر یہ سلگنی لگی رہنی چاہیے۔ انسان سے بھی بڑے بڑے کارنامے کرو جاتی ہے یہ تو پ، یہ جلن..... عام طور پر، آدمی گیلی تیلی کی طرح ساری عمر سلیں سے بھری غم زندگی گزار دیتا ہے، مگر جلتے کے لیے ہاتھ کی رگڑ میٹر نہیں آتی۔ اس لڑکی کے ناکام محبت نے تجھیں وہی رگڑ دے دی ہے، اب جل گئے ہو تو خود کو کھنچے مت دیتا۔“ اُس وقت مجھے ناساز کی بات ٹھیک طرح سمجھ نہیں آئی، مگر اس نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ جب ہفتہ ر میں آخر کار دن ہونا ہی لکھا ہے تو پھر یہ کُجھ کُجھ اور سنگ سنگ کر جینا کیسا؟ جیز جیز کتے شعلے کی طرح جل کر راکھ ہو جانے ہی میں مزہ ہے۔ میں بھی اُس روز کے بعد کُجھ ایسا نکلا کہ اندر سب کچھ بسیم ہو گیا۔ بس میں، میری کتابیں، میری چھت اور آسمان پر رات کو چمکتے میرے دوست ستارے، یہی کُجھ باقی رہ گیا تھا زندگی میں۔

اگلے سال کالج والوں نے رحم کھا کر ناساز کو سندھ سے سی دی، تو وہ اپنے گاؤں واپس جانے سے پہلے مجھ سے لپٹ کر رو پڑا۔ ”اپنا خیال رکھنا اور مجھے بھول مت جانا“ میں ہنگلی پکوں کے ساتھ اسٹیشن پر اس کی گاڑی کو چھوٹنے دیکھتا رہا اور پھر، بوجھل قدموں کے ساتھ گھر واپس آ گیا۔ کالج کے فائل ایئر سے قفل ہی، پہلے ابا اور پھر اماں کے بعد دگر سے چل رہے، پر مجھے پہلی بار تیشی کا احساس اُس وقت ہوا، جب بھائی بھابھوں نے گھر کے خرچے میں ہاتھ بٹانے کا حکم صادر کر دیا۔ ان سب کی خواہش تھی کہ میں یونیورسٹی میں داخلے کا ارادہ ترک کر کے کہیں ٹھکر یا چپڑہی کی نوکری کر دوں گا۔ تب تک شام کا اندھوں سے ہٹ جائے۔ مگر میں نے کسی نہ کسی طرح انہیں قائل کر لی لیا کہ کسی سرکاری نوکری کے پتے ہی میں تعلیم کا سلسلہ ترک کر دوں گا۔ تب تک شام خپ کر لہن ہو چکا تھا۔ کالج میں بھی فائل میں، میری تیسری پوزیشن آئی تھی۔ تعلیمی ادارے مجھے فخر سے اپنے ادنیٰ پر دیگر اموں اور مشاعروں میں مدعو کرتے تھے۔ میرا نام ایک انجمن تہذیبی ہوئے نو جوان شاعر کے طور پر شہر کے گلی کوچوں میں پھیل رہا تھا، لوگ میری سوچ اور لفظوں کی مدح سرائی کرتے تھے، ہاں اگر کچھ نہیں بدلاتا تو میری صورت دیکھتے ہی لوگوں کا وہ بے اختیار تاثر، البتہ اب لوگوں کے رویے میں اتنی منافقت ضرور آگئی تھی کہ بچپن میں وہ میرے منہ ہی پر ہنس دیتے تھے، مگر اب قہقہہ میرے پٹ جانے کے بعد چھوٹا۔ اپنے ڈیپارٹمنٹ کی تعارفی کلاس میں بھی، جب مجھے لکچر ہال کے ڈاس پر بلایا گیا تو آس پاس سے ہلکی ہلکی سرگوشیاں بلند ہونے لگیں۔ ”ارے! تو یہ ہے پری زاہد.....“ ”آئے بائے..... سارا مزہ کر کر اکر دیا“ ”شاعری تو غضب کی کرنا ہے، مگر شخصیت..... تو بد تو ہے.....“ ”نہیں نہیں، یہ پری زاہد نہیں ہو سکتا، یہ تو کسی فیکٹری کا فوٹو مین لگتا ہے۔“ میں یہ ساری سرگوشیاں اور فخر سے سُنے ہوئے ان کے درمیان سے چلتا ڈاس پر آ گیا۔ کلاس پر ایک سکوت طاری تھا۔ میں نے اپنا نام بتانے کے بعد کسی لمبی چوڑی تمہید کے بجائے صرف تین مصرعوں پر اکتفا کیا۔ ”قصے میری الفت کے جوہر قوم ہیں سارے..... آد کچھ تیرے نام سے موسوم ہیں سارے..... شاید یہ ظرف ہے، جو خاموشیوں اب تک..... روند تو تیرے عیب بھی معلوم ہیں سارے..... سب جرم میری ذات سے منسوب ہیں محسن..... کیا میرے سوا اس شہر میں معصوم ہیں

سارے..... ۱۹ دوس، میں اپنی بات ختم کر کے ڈاکس سے اتر آیا، گزرتے دنوں کے ساتھ میری کلاس نے بھی میری بد صورتی سے سمجھوتا کر لیا، مگر، میں خود اپنے اس بے چین اور بے قرار دل کا کیا کرتا؟ کبھی کبھی تو میں کرتا کوئی تیز و دھار خنجر سے کر اپنا سینہ چیر ڈالوں اور خود اپنے ہاتھوں سے یہ روگی دل نکال کر اس کے اسنے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کر دوں کہ پھر کبھی کوئی ٹکڑا اپنے میں جڑنے نہ پائے، مگر پھر میرا سدا کا نادان دل مجھ سے سوال کرتا کہ آخر اس کی خطا ہی کیا تھی۔ صرف اتنی کہ کوئی اسے بھی کبھی اک پیار نہ کری نظر سے دیکھ لے، صرف ایک نظر..... جو صرف میرے لیے ہو۔ میرا اس ایک نظر کے لیے ہر احساس، بالکل پاک تھا۔ مجھے تو بس ایک لمحہ ہی ساری زندگی کے بدلے درکار تھا۔ ایک پل، جب کوئی مجھے اپنا مان لے۔ کیا یہ خواہش، یہ تمنا اتنی ہی مشکل اور ناجائز تھی کہ میں اس کے اپنے اندر جاگ اٹھنے ہی پر ساری زندگی خود کو ملامت کرتا ہوں۔ آخر یہ دنیا ایسی ہر نظر، خوب روؤں کے لیے کیوں بچا رکھتی ہے، کیا مجھ جیسوں کے لیے کسی کے مشکل میں ایسی ایک نظر کی بھیک بھی نہیں۔

اُس روز بھی میں یونیورسٹی کی ایک ششمان راہ داری سے گزرتے ہوئے کچھ ایسے ہی بے سرو پا خیالات کی یلغار کا شکار تھا کہ اچانک اپنے عقب میں کسی لڑکے کی آواز سنائی دی۔ ”مستر پی زی زاد.....“ میں نے رک کر دیکھا، انگریزی ڈیپارٹمنٹ کا ایک چٹلڈم سالز کا حتام اپنے دو، تین کلاس فیلوز کے ساتھ میری جانب بڑھ رہا تھا، جن میں شعلہ جوالا قسم کی ایک لڑکی بھی تھی۔ ”آپ اردو ڈیپارٹمنٹ کے پی زی زاد ہیں ناں، میرا نام حتام ہے، یہ باسط اور یہ ہماری دوست لیلی۔ ہم تینوں انگلش ڈیپارٹمنٹ سے ہیں۔“ ”جی فرمائیے.....“ میں نے کہا تو حتام کے بجائے لیلی ہوئی۔ ”در اصل ہمیں آپ کی مدد چاہیے۔ ہم پی پی پی کے لیے، پر فارم کرنا چاہتے ہیں، مگر ہمیں اجازت اسی صورت ملی ہے کہ ڈرامے کا ایک شوارڈر تھے کے ساتھ کبھی خوش کیا جائے۔ کیا آپ ہمارے لیے ڈرامے کا ترجمہ کر دیں گے.....؟“ میں نے ان تینوں کے تجسس چہروں پر نظر ڈالی۔ ”کوشش کروں گا کہ کر پاؤں۔ ویسے کس ڈرامے کا ترجمہ کرنا ہے۔“ وہ تینوں خوش ہو گئے اور باسط جلدی سے بولا۔ ”اوتھیلو (OTHELO)۔“ ”ٹھیک ہے، آپ لوگ تین چار دن کی مہلت دیں۔ میں ترجمہ کر کے آپ لوگوں کو بتا دوں گا۔“ ان تینوں نے خوش ہو کر نعرہ لگایا۔ ”گریٹ“ اور جاتے وقت بڑے پُر جوش انداز سے ہاتھ ملایا۔ لیلی نے ہاتھ ملاتے ہوئے میں نے بڑی مشکل سے اپنے ہاتھ کی لڑزش پر قابو پایا۔ تیسرے دن میں ترجمے کا پہلا ڈرافٹ لے کر انگلش ڈیپارٹمنٹ میں حتام گرپ کی تلاش میں نکلا تو پتا چلا کہ سارا گرپ آئیڈیوٹیم میں ڈرامے کی ریسرچ میں مصروف ہے، میں پپ چاپ ہال میں داخل ہو کر آخری نشستوں پر بیٹھ گیا۔ ہال میں گلابی ہی ہیکسل روشنی چلتی ہوئی تھی۔ صرف سامنے ہال کے اسٹیج پر تیز لائٹس تھیں۔ سب ہی اداکاری کے بہترین جوہر دکھا رہے تھے مگر لیلی کی اداکاری الگ ہی تھی۔ وہ بہت ڈوب کر مکالمے ادا کر رہی تھی اور سارا گرپ تھوڑی تھوڑی دیر بعد اسے خوب جم کر داد بھی دے رہا تھا۔ لیلی ایک ننھی ہوئی اداکارہ کی طرح آخری سین میں ہیر وئن کی موت کا منظر پیش کر رہی تھی۔ میں خود اس کی اداکاری میں اس قدر کھو چکا تھا کہ جب اس نے آخری سانس لے کر سر ڈھکا تو بے اختیار ہی اپنی جگہ پر کھڑے ہو کر تالیاں بجانے پر مجبور ہو گیا۔ سب نے چونک کر مجھے دیکھا اور زور سے چلائے۔ ”ارے..... تم ہو پی زی زاد..... آؤ اسٹیج پر آ جاؤ۔“ حتام نے باقی لوگوں سے میرا تعارف کراتے ہوئے بتایا کہ میں اس ڈرامے کا اردو ترجمہ کرنے والا ہوں۔ میں نے لیلی کو اس کی اداکاری کی داد دی تو وہ سر جھٹک کر بولی۔ ”نہیں، ابھی میں پوری طرح سے خود کو کردار میں ڈھال نہیں پا رہی۔ میرا خیال ہے کہ جب ہیر وئن کی موت ہو تو اُس وقت کچھ اشعار یا کوئی غم گین نظم ضرور اوروں پر ہونی چاہیے..... جب ہم، ہم، ہم پورے ہال کو رونے پر مجبور کر دیں گے۔“ انگریزی ڈیپارٹمنٹ کے باقی کچھ طلبہ، جو اس ڈرامے میں حصہ لے رہے تھے، مجھے اس طرح دیکھ رہے تھے، جیسے میں کوئی مجبور ہوں۔ وہ سب کے سب اونچے گھرانوں کے چشم و چراغ تھے۔ ان کے قیمتی لباس، کلون اور پرفیوم کی مہک، ہاتھوں میں پہنی قیمتی گھڑیاں، بریسلس اور ایک جانب بے پروائی سے پیچھے گئے مینگے، گینز اور جینز جیکٹس، میری سادہ سفید شرٹ اور پانچ سال پرانی گھسی ہوئی چٹلون سے بالکل بھیجلی نہیں دکھ رہے تھے۔ دراصل امارت کی بھی اپنی ایک خاص چکا چوند ہوتی ہے، جسے کسی تشریح کی ضرورت نہیں پڑتی اور غربت..... سات پردوں میں بھی نہیں ہو تو، شناخت بچھپائے نہیں جھپتی۔ لیلی کی کچھ انگریزی میڈیم سٹیڈیوں نے اسے گھٹی مار کر کچھ کہا اور سب زور سے ہنس پڑیں۔ لیلی نے مجھ سے نظر بچا کر ان سب کو انگریزی میں ڈانٹا اور اپنے روئے پر قابو پانے کی ہدایت کی۔ میں نے لیلی کو بتایا کہ میں نے اوتھیلو کا ترجمہ کر لیا ہے اور اگر وہ لوگ چاہیں تو کل ہی سے اردو ڈرامے کی بھی ریسرچ شروع کر سکتے ہیں۔ حتام نے مجھے بھی ریسرچ دیکھنے کے لیے آنے کی درخواست کی تاکہ میں ان کے تعلق کی جانچ بھی کر سکوں۔ ہاں، زندگی کی دوڑ میں ہم اردو میڈیم والوں کے پاس آخر میں صرف یہی ایک تلفظ ہی باقی رہ جاتا ہے۔

رات کو جب میں گھٹلی چھت پر تاروں کی اوڑھنی کے نیچے لیٹا، ڈرامے کے بارے میں سوچ رہا تھا تو مجھے لیلی کی بات یاد آئی کہ اگر لڑکی کی موت کے پس منظر میں کوئی درد انگیزی نظم ہو تو تاثر دہلا ہوا جائے گا۔ ”اوتھیلو“ کے اختتام پر ہیر وئن کی لگائی ہوئی شب کی آگ میں مجلس کر خود اپنے ہاتھوں سے ہیر وئن کو لگا دبا کر مار دیتا ہے اور پل بھر کی نفرت کا قلب ساری عمر کی محبت کو گل لگاتا ہے۔ مجھے یہ بات کبھی سمجھ نہیں آتی تھی کہ انسان کی برسوں کی محبت کا امرت گھڑی بھر میں نفرت کے کڑوے زہر میں کیسے تبدیل ہو جاتا ہے؟ یا پھر شاید محبت اور نفرت دراصل ایک ہی سکتے کے دو رخ ہیں۔ جذبات کے بازار میں دونوں کا مول یک ساں رہتا ہے، مگر جب کسی انسان کو دوسرے سے نفرت ہو جاتی ہے، تو وہ اس سے وابستہ چیزوں، بچپنوں، یادوں اور ایک دوسرے سے جوئے معمولات سے بھی کیوں نفرت کرنے لگتا ہے۔ جس راستے پر کبھی دو پیار والے ایک ساتھ چلے تھے، وہ راستہ کیوں علاحدہ منسوب ہو جاتا ہے۔ وہ ایک بیٹج، جہاں کبھی وہ ساتھ بیٹھے تھے، بارش میں گیلی سڑک کے کنارے کھڑا وہ چائے والا، جس کے ایک کپ میں دونوں نے ساتھ چائے پی تھی۔ وہ کتابوں کی پرانی دکان، پہلی ٹوٹی ہوئی چوڑی کا ٹکڑا، جھنڈوں میں رکھا وہ سوکھا گلاب، پرفیوم کی خالی شیشی، بچی ہوئی وہ آدھی صپا سنگ، ایک کھو ہوا کاف لک، ایک ساتھ دیکھی ہوئی فلم کا ٹکٹ، وہ فٹ پاتھ پر بچے پتے، وہ پرانا بس اسٹاپ، 23 نمبر کی کھنار اسی بس، درخت کے نیچے کھڑا وہ لیوٹ پانی والا..... بھلا ان سب چیزوں کا ان کی بدلتی محبت اور نفرت میں وہ قطعی اس کڑا وہت سے کیا تعلق.....؟؟؟ ہم اس ایک شخص کی نفرت میں ان سب یادوں، باتوں اور جگہوں کو کیوں شامل کر لیتے ہیں۔ انسان کتنا غلام ہے کہ معصوم یادوں سے بھی انتقام لینے سے باز نہیں آتا۔



ڈرامے والے ہال کچھ گچھا بھرا تھا۔ ساری یونیورسٹی اور تھیلو کوارڈینسٹس بیٹے دیکھنے کے لیے جمع تھی اور..... ہیروئن کی آخری سانس نکلتے سے پہلے پس منظر میں میری نظم کے بول گونج اٹھتے ہیں۔ سنو، تمہاری وفا پر..... مگر چہ پورا یقین ہے، مگر..... بدلتی رزقوں کے دار کا، کچھ مجھ و سنا نہیں..... سو، کرکھی ایسا ہو کہ..... تمہیں مجھ سے نفرت ہو جائے..... اور میری روح کی کوئل پٹھڑیاں..... تمہیں کسی ببول کے مانند ٹھٹھے لگیں، تو..... بیٹے دنوں کو یاد نہ کرنا..... کہ یادوں کا زہر، زخم کو بھرنے نہیں دیتا..... ہاں مگر دیکھو، کبھی ان باتوں سے نفرت نہ کرنا..... جو ہم نے گھٹنوں ایک ساتھ بیٹھ کر کی تھیں..... کہ باتیں تو معصوم رابطہ ہوتی ہیں..... اور کسی کم نصیب کی بے دردی سے..... ان باتوں کا کیا لینا دینا.....؟ ڈرامے کے منظر میں اونیٹلو ہیروئن کے پاس پہنچتا ہے۔ رات ڈھل رہی ہے اور ہیروئن (ڈیسنڈی مونا) سو رہی ہے۔ اونیٹلو اپنی محبوبہ کو جگا تا ہے اور سر دھچکے میں اس سے کہتا ہے کہ وہ اپنی آخری دعا کر لے۔ اونیٹلو کی محبوبہ کی آنکھوں میں آنسو بھرا آتے ہیں، وہ اپنے محبوب سے التجا کرتی ہے کہ وہ اسے آج کی رات چھینے دے، پھر چاہے تو صبح مار ڈالے، مگر اونیٹلو کی آنکھوں پر شک کے کالے ناگ کس کر پنی بانہہ پکے ہیں، وہ کہتا ہے ”اب بہت دیر ہو چکی.....“

جس منظر میں نظم کے بول اور لپ ہو رہے تھے۔ اور سنو، میرے محبوب..... کبھی ان رنگوں سے نفرت نہ کرنا..... جو مجھے بہت اچھے لگتے تھے..... کہ رنگ تو روح کو اجالتے ہیں..... اور کسی کے مقدر کے اندھیروں سے..... ان رنگوں کا کیا لینا دینا.....؟ ڈیسنڈی مونا آخری مرتبہ اپنے محبوب، اونیٹلو کو پتیلی پلکوں سے نظر بھر کر دیکھتی ہے۔ اونیٹلو کے ہماری ہاتھوں کی انگلیاں اس کی نازک شرک کو دبا کر شروع کر دیتی ہیں۔ لڑکی سانس ٹھٹھنے کی وجہ سے تڑپتی ہے اور ہسٹر کی چادر نیچے گر جاتی ہے۔ اے میری وفا کے مالک..... کبھی ان نظاروں سے نفرت نہ کرنا..... جو ہم نے ایک ساتھ دیکھے تھے..... کہ نظارے تو قدرت کا شمس ہوتے ہیں..... اور کسی حرام نصیب کی بدصورت یادوں سے..... ان نظاروں کا کیا لینا دینا.....؟ اونیٹلو کی مضبوط گرفت میں اس کی محبوبہ کا دم ٹھٹھ رہا ہے اور وہ بن پانی کی چھلی کی طرح تڑپ تڑپ کر جان دے رہی ہے۔ اونیٹلو کی آنکھیں وحشت سے ہا کر کوئل رہی ہیں، مگر وہ پوری قوت سے اپنی جان سے پیاری ڈیسنڈی مونا کا گلا گھونٹ رہا ہے۔ تکلیف کی شدت سے اس کی محبوبہ کی انگلیوں کے ناخن اونیٹلو کے بازوؤں کی رگوں میں پیوست ہوئے جا رہے ہیں۔ لڑکی کا نازک بدن آخری مرتبہ زور سے کانپتا ہے۔ میرے ہم نفس..... میری جان..... بس مجھ سے، اور صرف مجھ سے نفرت کرنا..... کہ میری روح کی سیاہی سے سی..... یہ چارٹو اندھیرا ہے۔ اونیٹلو کی محبوبہ اپنے محبوب کی گرفت میں تڑپ کر آخری پٹکی لپٹی ہے اور اس کی روح نفسِ معصری سے پرواز کر جاتی ہے، مگر مرتے مرتے بھی اس کے بے جان گھٹنی آنکھیں اپنے پیارے اونیٹلو کو دیکھ رہی ہیں، لڑکی کا محبوب، اس کا قاتل، اونیٹلو اپنی محبوبہ کا سر گود میں لیے بیٹھا رو رہا ہے اور اسٹنچ کا پردہ گر جاتا ہے۔

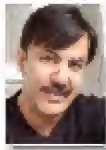
ڈراما ختم ہونے کے بعد چند لمحوں تو سارے ہال میں سہا سا چھایا رہا اور پھر تالیوں کی گونج میں وہ شور مچا کہ بس..... لٹنی راتوں رات سارے شہر کی یونیورسٹیوں میں مقبول ہو چکی تھی۔ ڈرامے کی کامیابی کی خوشی میں اس نے اپنے گھر ایک پارٹی رکھی اور ہم سب کو تاکید کے ساتھ دعوت دی۔ میں نہیں جانا چاہتا تھا، مگر اس نے میری ایک نہیں سنی اور مجبور اٹھے اس شام وہاں جانا ہی پڑا۔ گھر کیا تھا، اک محل تھا۔ مغربی طرز کا ایک وسیع و عریض پھولوں بھرا باغیچہ، جس کے درمیان پر یوں کے گھر جیسی ایک شان دار عمارت کھڑی تھی۔ پچھلی جانب سوئمنگ پول تھا اور پارٹی کا بندوبست وہیں کیا گیا تھا۔ موسیقی کا اجتماع بھی تھا۔ لٹنی کہیں سے اپنی ماں کو کھینچتی ہوئی لے آئی اور ان سے میرا تعارف کروایا۔ قیمتی ساڑی میں ملبوس، ہیرے جوہرات سے لدی پھندہ ای اس عورت نے مجھے غور سے دیکھا اور ہونٹ کھینچ کر کہا۔ ”خوب..... تو یہ ہے پڑی زاد.....؟“ انٹر سٹنگ..... میرا کیا چاہا لٹنی کے کان میں دھیرے سے کہوں کہ ایسے جانے کتنے مناظر میں اردو فلموں میں دیکھ چکا ہوں، جہاں امیروں کی محفل میں غریب کو اس کی حیثیت یاد دلائی جاتی ہے، پھر مجھے خود اپنی سوچ پر فہمی آگئی۔ اتنے میں میرے عقب سے ایک بنگلی ہوئی آواز بلند ہوئی۔ ”افواہ..... تو یہ ہیں مسٹر پڑی زاد..... جن کی شاعری ڈرامے میں ڈب کی گئی تھی، بھئی واہ لٹنی، کیا اداکاری کی تھی تم نے.....“ میں نے پلٹ کر دیکھا۔ ایک بچی عمر کا مونا شمس آہستہ آہستہ ڈوگھاتے قدموں سے ہماری جانب چلا آ رہا تھا۔ لٹنی نے تعارف کروایا کہ ”یہ سیٹھ عابد ہیں، ان کے خاندانی دوست.....“ وہ شخص لٹنی سے بہت بے تکلف ہوئے کی کوشش کر رہا تھا یا پھر یہ نشے کا کمال تھا۔ میں ایک جانب ہٹ کر کھڑا ہو گیا تاکہ لٹنی کو فرست ملے تو میں اس سے اجازت لے کر، وہاں سے نکل جاؤں۔ سیٹھ عابد کھانا لے کر چلا تو اس کی نظر پھر مجھ پر پڑ گئی اور وہ میری طرف چلا آیا۔ ”اور جناب! کیا مصروفیات ہیں آج کل، دراصل میں خود بھی چھوٹا مونا شاعر ہوں، اور چاہتا ہوں کہ جلد ہی میری کتاب بھی میرے مداحوں کی پیاس بجھانے کے لیے شائع ہو جائے، مگر کیا کروں۔ یہ کاروبار اور دھندہ ہی جان نہیں چھوڑتا۔“ سیٹھ عابد نے وہیں کھڑے کھڑے اپنی دو چار غزلیں بھی مجھے سنائیں، جنہیں سن کر میں نے ٹھکر کیا کہ اس کی کتاب ابھی تک شائع نہیں ہوئی۔ سیٹھ عابد اپنی جھن میں گن بولے جا رہا تھا۔ ”لٹنی! تمہاری شاعری کی بڑی تعریف کرتی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ تم میری شاعری کی نوک پلک سنو اور اسے بھی ایسا بنا دو کہ وہ لٹنی کے معیار پر پوری اتر جائے۔“ میں نے حیرت سے سیٹھ عابد کی طرف دیکھا۔ صاف ظاہر تھا کہ وہ چاہتا تھا کہ میں اپنی شاعری اس کے نام کر دوں۔ سیٹھ عابد نے میری آنکھوں میں جھانکا۔ ”اور اس کام کے لیے میں ایک فطیر رقم دینے کو بھی تیار ہوں۔ لٹنی بتا رہی تھی کہ تم جھٹو پڑھا کر اپنی بڑائی کا خرچہ پورا کر رہے ہو۔“ میں اپنے فٹے پر قابو نہیں رکھ سکا۔ ”معاف کیجیے گا عابد صاحب، زندگی میں ہر چیز بکاؤ نہیں ہوتی۔“ عابد طرہ انداز میں مسکرایا۔ ”غلط..... آج کل سب بکاؤ ہے اور جس محفل میں آج تم کھڑے ہو، ان امراء کے لیے تو یہ شاعری، یہ خوب صورت الفاظ شخص ایک شام بہلانے کے کام آتے ہیں۔ ذرا ٹھنڈے دل سے سوچ لینا۔ میں نے بڑے بڑے قلم کاروں کے مسودے رڈی کے بھاؤ پکٹے دیکھے ہیں۔“ میں لٹنی سے اجازت لے کر واپس چلا آیا۔ جب انسان کے پاس دولت کی بہتات ہو تو اس کے اندر کا کباڑ یا کیوں جاگ جاتا ہے؟ کیا یہ بھی امیر ایک جیسے ہوتے ہیں؟ مگر لٹنی تو ان جیسی نہیں۔ میں نے ہمیشہ اس کی آنکھوں میں اپنے لفظوں کے لیے ایک خاص احترام دیکھا تھا۔ میرا بھولا دل ایک بار پھر راہ بھٹکنے کے بہانے ڈھونڈ رہا تھا۔

اگلے دن لٹنی نے مجھے یونیورسٹی میں پُچھ اور آداس دیکھا تو اُسے لگا کہ میں گزشتہ شام کے اس کی ماں کے سلوک سے دل برداشتہ ہوں۔ اس نے مجھ سے معذرت کی، مگر میں نے اسے تسلی دے دی کہ میں اس سلوک کا عادی ہوں، میری بات سن کر اس کی سیاہ جھیل سی آنکھوں میں ادا سی اتر آئی۔ مجبور اس کا دل بہلانے کے لیے مجھے اردو فلموں والی مثال دہرائی پڑی کہ اس کی پارٹی میں آنے سے پہلے میں نے درجن بھرائی فلمیں دیکھ کر خود کو پہلے ہی ذہنی طور پر تیار کر لیا تھا، البتہ بس ایک کی رہ گئی کہ وہاں کوئی بڑا سا بیلا تو نہیں تھا، جس پر بیٹھ کر ایسی چوہین میں غریب لڑکا ہیروئن کے لیے گانا گاتا ہے۔ میری بات سن کر وہ زور سے فہم پڑی۔ اور یوں لگا جیسے تیز بارش میں دھوپ نکل آئی ہو۔

اور پھر چند دن بعد لٹنی نے اچانک یونیورسٹی آنا بند کر دیا۔ میں نے اس کے سب دوستوں سے پوچھا، مگر کسی کو کچھ پتا نہیں تھا۔ آخر پانچویں دن میں دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر اس کے بھٹکے کے دروازے پر پہنچ گیا۔ چونکدار نے لٹنی کے نام پر مجھے گھر کے لان تک پہنچا دیا۔ لان میں لگے سنگ مرمر کے بڑے فوارے کے پاس لٹنی کی ماں کو بیٹھے دیکھ کر میرے قدم اٹکنے لگے۔ دوسرا جھکا مجھے لٹنی کی ماں کی انگلیوں میں پکڑے سرگود کچھ کر لگا۔ اس نے غور سے میری طرف دیکھا اور سرگینہ کی راگ بھجا کر بولی۔ ”لٹنی سے ملنے آئے ہو؟“ میں نے شیشا کر جواب دیا۔ ”جی،“ لٹنی کی ماں نے میری آنکھوں میں جھانکا۔ ”محبت کرتے ہو، میری بیٹی سے.....؟“ مجھے لگا، جیسے کسی نے میرے قدموں کے نیچے سے زمین کھینچ لی ہو۔ لٹنی کی ماں کی آنکھیں مجھے اپنے جسم کے پار ہوتی محسوس ہو رہی تھیں۔

(جاری ہے)





### .....ہاشم ندیم.....

ہاشم ندیم نو جوان نسل کے پسندیدہ، ملک کے معروف و منفرد ڈراما رائٹر، ناول نگار ہیں۔ ان کے ناول ”خدا اور محبت“ اور ”بچپن کا دبیز“ نے بین الاقوامی پذیرائی حاصل کی، توجہ، سندھے میگزین میں شائع ہونے والے ناول ”عبداللہ“ کو بھی وقت کے پسندیدہ ترین ناول کا درجہ حاصل ہوا۔ انہیں ان کی ادبی خدمات پر حکومت پاکستان نے تمغہ حسن کارکردگی سے نوازا۔ نیز فلم کے شعبے میں ”عبداللہ“ نامی ایک بین الاقوامی فلم کے تخلیق کار کی حیثیت سے بھی قدم رکھ چکے ہیں۔

”پری زاد“ ایک اچھوتے، حساس اور قدرے مشکل موضوع پر مبنی بہت دل گدازی تحریر ہے، یہ ایک ایسے شخص کی کہانی ہے، جسے اک کم صورتی کے عیب کے سبب، اس ظاہر پسند، زور پرست دنیا کے آن گشت بد صورت رویوں، بد ہیئت آئینوں کا سامنا کرنا پڑا۔ ناول سے متعلق اپنی آراء، آگاہ کرنا ہرگز مست محبوبے گا۔ ہمارا ہوا وہی پرانا ہے:

ایلیہ: ”سندھے میگزین“ روزنامہ جنگ، شعبہ میگزین، اخبار سنزل، آئی آئی چندر نگر روڈ، کراچی۔ ای میل:

sundaymagazine@janggroup.com.pk

لہٰذا لکھی کی ماں کی بات سن کر چند لمحوں کو تو میں لنگ سا رہ گیا۔ وہ مجھے غور سے دیکھتے ہوئے بولیں۔ ”جواب دو، کیا میں غلط کہہ رہی ہوں، تمہارے چہرے پر صاف لکھا ہے کہ تم لہٰذا سے محبت کرتے ہو۔“ میں کوئی جواب نہ دے سکا۔ پھر شاید ان کو خود ہی میری حالت پر ترس آ گیا۔ ”اندر چلے جاؤ، وہ ڈرائنگ روم میں ہوگی۔“ میں حیرت زدہ قدم اٹھاتا اندر کی جانب بڑھ گیا۔ لہٰذا ڈرائنگ روم کی کھڑکی کے قریب آؤ اس سی کھڑکی تھی۔ مجھے دیکھ کر ایک پچھلی سی مسکراہٹ اس کے لبوں پر پھیل گئی۔ ”پری زاد کیسے ہو؟“ میں نے ٹھوٹے ہی سوال کیا؟ ”آپ اتنے دن سے یونیورسٹی کیوں نہیں آئیں۔ سب ٹھیک تو ہے ناں۔“ لہٰذا نے میری طرف دیکھنے سے گریز کیا۔ ”ہاں..... میں نے یونیورسٹی چھوڑ دی ہے۔ مٹا نے میری شادی طے کر دی ہے۔“ میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔ ”شادی یوں اچانک، مگر کس کے ساتھ؟“ ”سینٹھ عابد کے ساتھ۔“ میری شادی عابد سے ہو رہی ہے۔“ یہ میرے لیے دوسرا جھکا تھا۔ ”سینٹھ عابد سے مگر، آپ اور وہ، میرا مطلب ہے، آپ کے لیے اس شخص سے کہیں بہتر لوگ موجود تھے۔“ لہٰذا کی پلکیں نم ہونے لگیں۔ ”بات میرے انتخاب کی نہیں ہے پری زاد۔ اوٹھی بولی کی ہے، جو بھی میرے لیے اوٹھی بولی لگے گا، میرا ہاتھ اس کے ہاتھ میں تھما دیا جائے گا۔ عابد کی بولی پندرہ کروڑ تھی۔ میری نیلا میں اس سے اوٹھی بولی کسی اور نے نہیں دی۔ لہٰذا مجھے عابد کے نام کر دیا گیا۔“ مجھ سے برداشت نہیں ہوا اور میں بول پڑا۔ ”بولی شریف لڑکیوں کی نہیں لگتی ہے لہٰذا جی، شریف گھرانوں کی لڑکیاں تو رخصت ہوتی ہیں، عزت کے ساتھ۔“ لہٰذا کی آنکھ سے ایک آنسو نچکا۔ ”تو پھر یہی سمجھ لو کہ میں بھی وہیں سے تعلق رکھتی ہوں، جہاں لڑکیوں کی بولیاں لگتی ہیں۔ رخصتی نہیں ہوتی۔“ مجھے سب کچھ گھومتا ہوا محسوس ہوا۔ ”یہ..... یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں؟“ ”ٹھیک کہہ رہی ہوں اب میں یونیورسٹی نہیں آؤں گی پری زاد۔ پندرہ دن کے بعد میری دنیا دکھاوے کے لیے دوسرے بھی ادا ہو جائے گی، جسے یہاں رخصتی کہتے ہیں۔“ لہٰذا کی آنکھیں اب باقاعدہ برسنے لگی تھیں۔ تم سوچ رہے ہو گے کہ یہ عالی شان گھر، یہ رہن کن اور میری یہ اعلیٰ تعلیم..... یہ سب دکھاوے پری زاد۔ ہماری یہ شان و شوکت ان ہی سینٹھ عابد جیسے لوگوں کے دم سے ہے۔ جسے لوگ کبھی بازار کس کہا کرتے تھے، اب وہ بازار کسی خاص علاقے تک محدود نہیں رہا۔ پچھلے کرشہروں کی ان اونچی اور اعلیٰ تہیوں تک پہنچ گیا ہے، اور جسے میں اپنی ماں کہتی ہوں، چائیں، وہ میری سگی ماں ہے بھی یا نہیں۔ یہ بھی اس کا احسان ہے کہ اس نے مجھے اپنی تعلیم کا شوق پورا کرنے دیا شاید یہ بھی بازار میں بولی بڑھانے کا ایک کارآمد ٹھوکہ ہوگا۔“ لہٰذا بولتے بولتے خاموش ہو گئی۔ میرے پاس بھی اب کہنے کے لیے کچھ نہیں بچا تھا، سو، واپسی کے لیے قدم اٹھاوے کے قریب کر دی لہٰذا کی آواز آئی۔ ”میں نے یہ سب کچھ تمہیں اس لیے بتایا ہے پری زاد کہ تم ایک سچے دوست ہو۔“ میں نے پلٹ کر سرٹھکائے سیاہ لباس میں ملبوس، دوپٹے نرمی شام جیسی لہٰذا کے وجود کو آخری بار اپنی ذہنی آنکھوں کے آئینے میں مویا۔ اس کے گلجانی عارض آنسوؤں سے زحل سے گئے تھے۔ ”لہٰذا جی..... کاش! میرے پاس پندرہ کروڑ روپے ہوتے تو میں آپ کو خرید کر آزاد کر دیتا۔ مگر آپ تو جانتی ہیں کہ زندگی کی اصل فلم میں لڑکے کے پاس لڑکی کے ماں باپ کو ادا کرنے کے لیے کبھی پیسے نہیں ہوتے۔ وہ تو بس کسی اور کے خریدے گئے پیا نو پر چڑھ کر جڈائی کا گانا ہی گا سکتا ہے۔“ لہٰذا کے ہونٹوں پر میری بات سن کر ڈاڑھ کے لیے ایک ہلکی سی مسکان اُبھری اور میں اس کا، وہی آخری مدھر مسکان بھرا چہرہ، آنکھوں میں لیے پلٹ آیا۔ لان میں فوارے کے قریب کر دی لہٰذا کی ماں ابھی تک بیٹھی فون پر کسی سے بات کر رہی تھیں۔ مجھے واپس جاتا دیکھ کر فون کاٹ دیا اور پھر ان کی کاروباری آواز نے جیسے میرے قدم جکڑ لیے۔ ”سنو لڑکے! امیری ایک بات ہمیشہ یاد رکھنا، زندگی میں کچھ حاصل کرنا چاہو تو اپنی جیب میں اس کے دام ضرور رکھو۔ شاید اس وقت میں تمہاری نظر میں ایک بہت بڑی عورت ہوں، مگر تمہیں ایک بچے کی بات بتا رہی ہوں۔ مرد کی شکل اور شخصیت کوئی نہیں دیکھتا۔ سب اس کا رتبہ اور عہدہ پر کھنٹے ہیں۔ دولت مرد کے ہر عیب، ہر غامی پر پردہ ڈال دیتی ہے۔ آئندہ زندگی میں کچھ پانا چاہو تو میری نصیحت ہمیشہ یاد رکھنا۔“

پندرہ دن بعد شہر کے تمام بڑے اخباروں میں ملک کے معروف صنعت کار، سینٹھ عابد کی دوسری شادی کی خبریں نمایاں طور پر شائع ہوئیں۔ میں نے بے زاری سے اخبارات یونیورسٹی کی لائبریری کی میز پر بیٹھ دیے۔ ٹھیک ہی کہا تھا لہٰذا کی ماں نے، سارا کھیل پیسے کا ہے، جیب میں دھیلا نہ ہو تو یہ سوچ، الفاظ، اعلیٰ خیالات اور ادب فن، سب کسی کام کے نہیں۔ دھڑی پاس ہو تو پھر سارا میلہ ہی اپنا ہے۔ میں ان ہی خیالات میں گھرا گھرا یا تو دونوں بڑے بھائی اور بھابیوں استقبال کے لیے تیار کھڑے تھے ”ہاں میاں..... اور کتنی چلے گی تمہاری یہ پڑھائی، گھر کے خرچوں کا کچھ اندازہ بھی ہے تمہیں۔ اب تمہاری ان شام کی ویڈیو میں گزرا رہے نہیں ہوتا۔“ دوسرے بھائی بولے۔ ”میں تو کہتا ہوں کہ پڑھ لکھ کر بھی تمہیں کون سا کھیل کھلے گا جاتا ہے۔ وہی کلری ہوگی اور وہی مینے بھر کے پانچ سات ہزار۔“ ”بھابھی نے مشورہ دیا، میری ماں تو کوئی کل وقتی ملازمت پکڑ لو۔ بھئی، سچ تو یہ ہے کہ اب ہمارے اپنے بچوں کے خرچے اتنے بڑھ چکے ہیں کہ ہمیں خود اپنے منہ سے کہنے شرم آتی ہے۔ تمہاری عمر کے محلے کے سب لڑکے لو کر یوں پر لگ کر اپنا گھر چلا رہے



ہیں۔" میرے لیے ان کے یہ جملے کچھ نئے نہیں تھے، بیٹے میں ایک آدھ بار یہ قسط وار سیر مل ضرور چلتا تھا، مگر آج نہ جانے کیوں میرا دل پہلے ہی اتنا بھرا ہوا تھا کہ میں نے نہ چاہتے ہوئے بھی تجلے لکھنے میں ان سب سے کہہ دیا کہ اگر اس گھر کا کاروبار میری کمائی کی وجہ سے رکنا ہوا ہے تو میں کوشش کروں گا کہ اسی ماہ کوئی نوکری یا مزدوری پکڑ کر ان سب کے منہ بند کروں۔ گھر والے ٹھیک ہی کہتے تھے، ڈگری مل جانے کے بعد بھی مجھ جیسے جانے کتنے نوکری کے لیے برسوں جو تیاں منگاتے پھرتے ہیں۔ اور پھر انٹرویو، جو کسی بھی نوکری کا لازمی جزو ہوتا ہے، اس کے لیے اچھی شخصیت کا ہونا بھی کبھی شرط اول بن جاتا ہے اور میری شخصیت..... مجھے تو شاید کوئی بڑی فرم یا دفتر انٹرویو کے لیے طلب ہی نہ کرے۔ مگر نوکری یا کام ملنے کے لیے میرے پاس کوئی منتر بھی تو نہیں تھا۔ مجھے یاد آیا کہ محلے کا ایک لڑکا، شوکی بچپن ہی سے کسی ویلڈنگ گھیراج پر مزدوری پر لگ گیا تھا اور اس کی ماں کے بقول ہر ماہ ایک معقول رقم گھر والوں کے ہاتھ پر لاکر رکھتا تھا۔ میں نے سوچ لیا کہ فاضل امتحانات، جو اگلے ماہ شروع ہو رہے تھے، ان کی تیاری میں مزید دقت ضائع نہیں کروں گا اور آج گھر جانے سے پہلے کوئی نہ کوئی کام ضرور ڈھونڈ کر پلٹوں گا۔ شوکی کے گھیراج کا پتا مجھے معلوم تھا۔ میں نے گھیراج کے گیٹ پر پہنچ کر سامنے کام کرتے لڑکے سے شوکی کے بارے میں پوچھا تو لڑکا شوکی کو بتانے اندر چلا گیا۔ میں نے آس پاس نظر دوڑائی۔ گھیراج کے گیٹ کے اوپر ایک بورڈ پر بڑا بڑا "استادستانہ ویلڈنگ گھیراج" لکھا تھا۔ کچھ ہی دیر میں شوکی نمودار ہوا اور مجھے گیٹ پر کھڑے دو کچھ گرم جوشی سے آگے بڑھ کر ملا۔ "ارے..... بڑی زاد بھائی آپ، یہاں..... سب خیر تو ہے؟" میں نے ایک لمبی سانس بھری۔ "ہاں، سب خیر ہے۔ مجھے تمہارے گھیراج میں کوئی کام مل سکتا ہے کیا، مجھے کام کی تلاش ہے۔" شوکی کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ "آپ، یہاں کام کریں گے مگر آپ تو بڑے کچھ ہو بڑی بھائی۔" میں نے شوکی کو ٹوٹے پھوٹے لفظوں میں سمجھانے کی کوشش کی کہ نوکری اب میری ضرورت سے بڑھ کر مجبوری بن چکی ہے۔ اتنے میں کڑے شلوار میں ملبوس اوپر سیاہ اسٹک سپنہ، کانوں میں موہنے کا کنبھول سجائے ایک شخص باہر سے اندر داخل ہوا، جس کے تیل میں چڑے بال ایک جانب سلیقے سے کڑھے ہوئے تھے۔ ہونٹوں پر پان کی لالی اور پتلی طرح وار مونچھیں، دونوں جانب سے اوپر اٹھی تھیں۔ اس نے شوکی کے سلام کے جواب میں مجھے غور سے دیکھا اور دھیرے سے گنگنا جتے ہوئے بولا "وہ آئے ہمارے گھر میں، خدا کی قدرت ہے..... میاں شوکی! یہ حضرت کون ہیں؟" شوکی نے جلدی سے میرا تعارف کروایا۔ "یہ بڑی زاد بھائی ہیں استاد جی، میرے محلے میں رہتے ہیں اور کسی کام کی تلاش میں ہیں۔" استادستانہ پر بھی میرے نام کا وہی اثر ہوا، جس کا میں ہمیشہ سے عادی تھا۔ میں نے درپیش آنے والی بحث کو مختصر کرنے کی غرض سے بولنے میں پہل کی۔ "اگر میری صورت اور تعلیم آپ کی راہ میں حائل نہ ہو تو کیا آپ مجھے کوئی کام دے سکتے ہیں۔ میں بہت محنت کروں گا اور جلد ہی سیکھ جاؤں گا۔" استادستانہ میری بات سن کر ایک دم سمجیدہ ہو گیا۔ "معاف کرنا میاں..... شاید تم نہ امان گئے۔ میرا مقصد تمہارا دل دکھانا ہرگز نہیں تھا، تم کرتے کیا ہو.....؟" میرے بولنے سے پہلے شوکی بول اٹھا "بڑی زاد بھائی یوٹی اور مٹی میں پڑتے ہیں استاد۔" استاد نے غور سے میری طرف دیکھا۔ "گتا ہے کوئی بہت بڑی مجبوری ہے؟" "ہاں، ایسا ہی سمجھ لیجیے۔" مستانہ استاد نے فیصلہ کرنے میں دیر نہیں لگائی، "ٹھیک ہے میاں..... کب سے کام پر آنا چاہتے ہو؟ فی الحال تمہیں دیہاڑی پر رکھ سکتا ہوں۔" میں نے آستینیں چڑھ لیں۔ "آج سے استاد۔" رات دیر گئے، میں گھر واپس پہنچا تو حسب معمول میرا انتظار کیے بنابست سوچکے تھا۔ میں نے اپنی زندگی کی پہلی مزدوری کی دیہاڑی کے روپے برآمدے میں پڑی چوکی پر رکھ دیے اور صبح سویرے منہ اندھیرے پھر سے اُٹھ کر گھیراج چلا گیا۔ استادستانہ اپنے مزاج کا ایک الگ ہی بندہ تھا۔ قلموں میں کام کرنے کا شوق، اسے لڑکپن ہی میں اس کے گاؤں سے شہر کو کھینچ لایا تھا، لیکن قسمت نے اداکار کے بجائے مسٹر بنا ڈالا۔ مگر اس کے اندر کا فن کار ابھی تک زندہ تھا اور مستانہ ابھی تک برقی قلم کا پہلا شو، پہلے دن دیکھنے کا حائل تھا اور پھر قلم شو سے واپسی پر گھنٹوں اس کے تہرے جاری رہتے۔ "کیا خاک کا اینٹنگ کی ہیرو نے، ہاں دن نے پھر بھی کچھ رنگ جمایا..... نہ میاں! موسیقی کا تو تیز و غرق ہی کر دیا ہے، ان نئے لڑکوں نے، اور شاعری بھی کیا بے ہودہ اور بکواس ہو گئی ہے، غو فلانے کا باپ، میں فلا نے کا بیٹا، بھلا یہ بھی کوئی شاعری ہے؟ شاعری تو جب ہوا کرتی تھی۔ جائے آپ کہاں جائیں گے، یہ نظر لوٹ کے پھرائے گی..... تیرے میرے سپنے اب ایک رنگ ہیں..... عجیب داستان ہے یہ، کہاں شروع، کہاں ختم..... واہ واہ کیا بات تھی اس شاعری کی۔" استادستانہ گھنٹوں بولتا رہتا اور ہم سارے شاگرد پچ چاب اس کے تہرے سننے رہتے۔ مجھے استاد نے ویلڈنگ پلانٹ پر بیٹھنے سے پہلے ایک طویل ٹیگنڈ دیا۔ "دیکھ میاں! یہ جو آگ کی چنگاریاں ہیں، یہ آج سے تمہارے لیے پھول کلیاں اور پتھر پیاں ہیں۔ یہ ایک آدھ دن ہی میں تمہارے لباس میں ہزاروں ننھے سنے شکاف ڈال دیں گی۔ تمہارے ہاتھوں اور جسم کے ٹھیکے حصوں پر انگاروں کی طرح برس کر تمہارے سارے جسم کو داغ دار کر دیں گی۔ شروع شروع میں کافی جلن بھی ہوگی، مگر پھر دھیرے دھیرے یہ آگ تمہاری دوست بن جائے گی اور تمہیں ان چنگاریوں کی عادت پڑ جائے گی۔ آگ کے ان جگنوؤں سے جتنی جلدی آشنائی ہو جائے، اتنا ہی بہتر ہے۔ ان سے بچنے کی کوشش کر دے گے تو کام نہیں سیکھ سکو گے۔" اب میں استاد کو کیا بتاتا کہ جو پہلے سے جل کر رکھ ہو چکے ہوں، ان کا بھلا یہ بھڑکنے آگ کیا بگاڑے گی؟ اور پھر جلنے کے لیے احساس زندہ ہونے کی ضرورت ہوتی ہے، مجھ جیسے بے حوصلے کے لیے کیا چنگاری اور کیا پھلجھری۔

یوٹی اور مٹی کا فاضل امتحان بھی میں نے جیسے شیعہ کر کے دے ہی ڈالا۔ حالانکہ اب مجھے ڈگری لینے میں کوئی خاص دل چسپی نہیں تھی۔ ان ہی دنوں میرے ہم جماعتوں نے مجھے بتایا کہ یوٹی اور مٹی کے سالانہ رسالے میں میری بہت سی شاعری کو اکٹھا کر کے ایک خاص نمبر بھی نکالا گیا ہے۔ میں نے کسی کے ہاتھ وہ رسالہ منگوایا اور ایک دن گھیراج میں بیٹھا اسی رسالے کی درق گردانی کر رہا تھا کہ استاد نے مجھے دیکھ لیا اور میرے ہاتھ سے رسالہ بچھٹ کر اس پر ایک طائرانہ سی نظر ڈالتے ہی اس کی آنکھیں کھل گئیں۔ "ارے واہ میاں! تو تم شاعر بھی ہو۔ یعنی کمال ہے، بتایا کیوں نہیں پہلے؟" میں نظریں چرا گیا۔ "اس میں بتانے لائق کیا تھا بھلا؟" "کیا مطلب، تم شاعری کو معمولی بات سمجھتے ہو۔ مجھ جیسوں سے اس کی قدر پوچھو میاں! کیا رچاؤ ہے تمہارے لفظوں میں، ہر ایک مصرع، دوسرے سے بڑھ کر، استاد نے ویں باہر سردیوں کی ذہنی دھوپ میں کرسی ڈالوائی اور سورج ڈوبنے سے قبل وہ سب کچھ حفظ کر ڈالا۔

میں بہت دیر سے لوہے کے ایک بڑے پڑی خاکلوہے کو کمانے کی ننگ دو میں الجھا تھا مگر اس دن ایسا لگ رہا تھا، جیسے شعلے کو بھی سمجھ سے کوئی ہیر ہو گیا ہے۔ جب انسان کا وقت نہ ہو تو ہر چیز اپنا تاثر کھودیتی ہے۔ شبنم آگ اگلنے لگتی ہے اور شعلے سر ہڈ جاتے ہیں۔ استاد مجھے بہت دیر تک اس سرزد چنگاری میں غلوا د کمانے کی لاکھا صل سچی کرتے دیکھتا رہا اور پھر اٹھ کر میرے قریب آ گیا۔ ”کبھی کبھی تو مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس بھڑکتی ہوئی آگ سے کہیں زیادہ وحش تمہارے اپنے اندر ہے، جو ہر پل تمہیں جھلساتی رہتی ہے۔ بڑی زامد مایاں، کیوں اپنی جوانی ان شعلوں میں رکھا کر رہے ہو، آخر ایسی کیا مجبوری ہے تمہاری۔“ میں نے مستانہ استاد کی آنکھوں میں جھانکا۔ ”پیسہ..... مجھے لگتا ہے میری ہر کم زوری، ہر عیب اور ہر خاکی کا علاج صرف پیسا ہے استاد اور مجھے زندگی میں بہت سارا پیسا کماتا ہے۔“ استاد نے بے چارگی سے میری طرف دیکھا۔ ”پہ، اس روزانی کمزوری سے تم کتنا کما سکو گے۔ دن رات محنت کرو، تب بھی مینے کے آخر میں تمہارے ہاتھ میں چندہ جس ہزار سے زیادہ کچھ نہیں آئے گا۔ البتہ چند سالوں کے اندر تمہاری جوانی ضرور گھل چکی ہوگی اور تمہاری نظر الگ جواب دے جائے گی۔“ میں بے بسی سے ہار کر بولا۔ ”تو پھر میں کیا کروں..... مجھے بہت پیسا کماتا ہے استاد۔ بہت زیادہ۔ اتنا زیادہ کہ اس کی چمک سے میرے وجود کا ہر داغ، ہر عیب بھپ جائے۔“ ”اگر تم پیسا کمانا چاہتے ہو تو وہی چلے جاؤ، وہاں اس ہنر کی بہت مانگ ہے، اگر قسمت نے ساتھ دیا تو چند سالوں میں کافی کمال کو گے۔ کم از کم اپنا گیراج تو کھول ہی سکو گے۔“ میں استاد سے یہ نہیں کہہ پایا کہ میں صرف ایک گیراج نہیں، یہ پورا شہر خریدنا چاہتا ہوں۔ ”استاد! کیا تم مجھے وہی سمجھا سکتے ہو کسی طرح؟“ ”وہی جانا اتنا آسان نہیں ہے مایاں۔ ویرانہ اور قدم جمانے کے لیے تین چار ماہ کے قیام پر چار پانچ لاکھ روپا تو لگ ہی جائے گا۔ اور پھر آگے تمہاری قسمت کہ تمہیں لمبے عرصے کے لیے کوئی کفیل ملتا ہے کہ نہیں۔“ اگلا پورا ہفتہ میں یہی سوچتا رہا کہ آخر، ہمارے مقدور ہر فیصلہ کا نغہ کے ان چند کھلوں ہی سے کیوں بخوار ہوتا ہے، لوہے کے پرانے صندوق سے سردیوں کے کپڑے ڈھونڈتے ہوئے میں ایسی ہی کسی سوچ میں گم تھا کہ اچانک میری نظر کاٹھ اور پونی ورشی کے دور میں لکھی گئی اپنی شاعری کے رجسٹر پر پڑی۔ کبھی میرا خواب تھا کہ میری شاعری کا مجموعہ بھی بازار میں آئے اور میری کتاب کی پزیرائی میں شہر کے دانش ور شاہیں منعقد کریں اور مجھے بھی لوگوں کے جگٹلے میں سرابا جائے۔ رجسٹر کے ورق پلٹتے ہوئے میری پلکیں جھٹکتی لگیں، کبھی کبھی مجھے یوں محسوس ہوتا تھا، جیسے ہمارے سینے میں دھڑکتے دل کا رشتہ باقی جسم سے کسی سوتیلے جیسا ہوتا ہے۔ سارا جسم اور اعضاء برب ایک دوسرے کے ساتھ تال میل میں جڑے رہتے ہیں، تب یہ ہیو تاجا اور اداس کی روٹھے بچے کی طرح ڈور بیٹھا کسی اور ہی دنیا میں گم ہوتا ہے۔ رجسٹر میں لکھی میری شاعری بھی کسی ایسے ہی سوتیلے اور روٹھے بچے کی باتوں جیسی تھی۔ اگلے روز میں عابد گروپ آف ٹیکنیگز کے گیٹ پر کھڑا تھا۔ پہلے تو چونک کر نے میرا حلیہ دیکھتے ہی مجھے صاف منع کر دیا، مگر جب میں نے اپنے نام کی پرچی انگریزی میں لکھ کر اس کے حوالے کی کہ دو ایک بار استقبالیے پر جا کر اسے اندر بھجوا دے، اگر انکار ہوا تو میں گیٹ ہی سے واپس لوٹ جاؤں گا، تو چند لمحوں سوچنے کے بعد وہ اندر چلا گیا۔ مجھے اندر بلایا گیا اور گھنٹہ بھر انتظار کے بعد میں بیٹھ عابد کے دفتر میں اس کے سامنے کھڑا تھا۔ بیٹھ عابد نے رگڑا کر ایک لمبا سا کش لیا اور طنز یہ انداز میں بولا۔ ”کیوں، میں نے کہا تھا ناں، اس دنیا میں ہر چیز بکاؤ ہے، بس ٹھیک قیمت لگانے والا ہونا چاہیے، تو بولو، کتنی قیمت رکھی ہے تم نے اپنی شاعری کی۔“ میں نے اپنا رجسٹر اس کے سامنے میز پر رکھ دیا۔ ”مجھے وہی کاٹھ اور بڑے کا خرچہ چاہیے۔ اگر آپ سے کیسے تو.....“ بیٹھ عابد نے رجسٹر اٹھا کر کسی دکان دار کی طرح اسے پہلے تو لا اور پھر ورق گردانی کی۔ ”ٹھیک ہے، شاعری میری کم زوری ہے، مگر پھر بھی دو سو صفحات کی یہ قیمت بہت زیادہ ہے۔“ میں نے اس کباڑے کو غور سے دیکھا۔ ”آپ چاہیں تو بطور قرض مجھے یہ رقم دے دیں اور اسٹامپ لکھوا لیں کہ میں کسی خاص مدت کے بعد آپ کو یہ پیسے واپس لوٹا دوں گا۔ شاعری البتہ ہمیشہ کے لیے آپ ہی کی رہے گی۔“ بیٹھ عابد کے ہنہوں پر جی طنز یہ مسکراہٹ مزید گہری ہو گئی۔ ”واپس لوٹا بھی سکو گے یا دینی چا کر خائب ہو جاؤ گے.....؟ چلو ٹھیک ہے۔ میرا سیکرٹری تم سے شاعری کے حقوق کے بارے میں کچھ دستاویزات دیکھ کر والے گا۔ تمہارا وہی کاٹھ اور بڑے امیر سے ذمے رہا۔“ میں واپسی کے لیے پلٹ کر دروازے تک پہنچا ہی تھا کہ اس کی آواز دوبارہ سنائی دی۔ ”نٹنی! اب بھی کبھی تمہاری شاعری کی تعریف کرتی ہے۔ مجھے امید ہے، تم نے اس رجسٹر میں لکھی شاعری اسے نہیں سنائی ہوگی۔“ میں نے دروازے کا پینڈل گھمایا۔ ”آپ بے فکر رہیں، یہ نظمیں اور غزلیں کسی کے کانوں تک نہیں پہنچیں اور آج کے بعد یہ میرے حافظے سے بھی ہمیشہ کے لیے مٹ جائیں گی۔“ اور دروازہ کھول کر باہر نکل آیا۔

مستانہ استاد حسب معمول اپنا چھوٹا سا ریڈیو کانوں سے لگائے کھڑا تھا اور عالم گیری کی آواز کے ساتھ سر دھن رہا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی بولا ”آؤ مایاں آؤ! کہیں تمہارا دل بھی تو اپنے استاد سے ٹھہر نہیں گیا۔ آج کل گیراج میں بھی دل نہیں لگ رہا تمہارا۔ ناٹ پر ناٹے کرنے لگے ہو۔“ میں نے استاد کا ہاتھ پکڑ کر اسے اپنے قریب بٹھالیا۔ ”استاد! میرے وہی جانے کا بندوبست کرو ورنہ اور بڑا لگوا لیا ہے میں نے۔ وہاں تمہاری کوئی جان پہچان ہے تو جتاؤ۔“ استاد کے ہاتھ سے ریڈیو نیچے گر گیا، اس نے لپک کر مجھے سینے سے لگا لیا۔ ”واوا خوش کر دیا بیادے، میں جانتا تھا کہ تم ایک دن ضرور کچھ کر دکھاؤ گے..... کب جانا ہے؟ میرا ڈور کا ایک برخواستہ دروازہ ہوتا ہے وہاں۔ میں آج ہی اسے فون کر دیتا ہوں، تم اسی کے ساتھ رہو گے۔ وہ بھی وہاں آگیا ہے، کئی سال سے..... رفیق نام ہے اس کا۔“

اگلے تین چار ہفتے یوں گزرے، جیسے چار پل گزرے ہوں۔ بھائی بھابھیاں اور گھر والے آخری وقت تک یقین اور بے یقینی کی کیفیت میں رہے اور پھر وہ دن بھی آچنچا، جس دن میں اپنا مختصر سا سامان ہاتھ سے اتر پورٹ پر کھڑا تھا۔ میں نے اس سے پہلے کبھی جہاز سے تو کیا ٹرین سے بھی کوئی لمبا سفر نہیں کیا تھا۔ اس لیے مجھ سے وہ تمام حقائق سرزد ہوتی رہیں، جو مجھ جیسے کسی بھی فرد سے پہلی بار ہوائی سفر میں ہو سکتی تھیں۔ جہاز نے وہی اتر پورٹ پر لینڈ کیا اور میں گھنٹہ بھر بعد باہر نکلا، تو بہت دیر انتظار کے باوجود مجھے رفیق کہیں نظر نہیں آیا۔ اتر پورٹ سے باہر جانے کا سوچ ہی رہا تھا کہ اچانک کسی نے میرے کاندر سے پر ہاتھ رکھا۔ میں چونک کر چلا، آنے والا شخص مجھے کڑی نظروں سے گھور رہا تھا۔ ”بھلی ویڑے پر وہی آئے ہو، جانتے ہو، اس کی سزا کیا ہے.....؟“

(جاری ہے)





### بشیر ندیم

بشیر ندیم، نوجوان نسل کے پسندیدہ، منگک کے معروف و منفرد رمارمارسز، ناول نگار ہیں۔ ان کے ناولز ”خدا اور محبت“ اور ”بچپن کا دبیر“ نے بین الاقوامی پڑائی حاصل کی، تو جنگ، سنڈے میگزین میں شائع ہونے والے ناول ”عبداللہ“ کو بھی وقت کے پسندیدہ ترین ناول کا درجہ حاصل ہوا۔ انہیں ان کی ادبی خدمات پر حکومت پاکستان نے متحدہ شمس کارکردگی سے نوازا۔ نیز فلم کے شعبے میں ”عبداللہ“ نامی ایک بین الاقوامی فلم کے تخلیق کار کی حیثیت سے بھی قدم رکھ چکے ہیں۔

”پڑی زاو“ ایک اچھوتے، حساس اور قدرے مشکل موضوع پر مبنی بہت دل گداز سی تحریر ہے، یہ ایک ایسے شخص کی کہانی ہے، جسے اک کم صورتی کے عیب کے سبب، اس ظاہر پسند، زر پرست دنیا کے ذوق گنت بد صورت رویوں، بد حیثیت آئینوں کا سامنا کرنا پڑا۔ ناول سے متعلق اپنی آراء سے آگاہ کرنا ہرگز مست جھوٹے لگے گا۔ ہمارا پتا دہی پرانا ہے:

ایڈیٹر ”سنڈے میگزین“ روزنامہ جنگ، شعبہ میگزین، اخبار منزل، آئی آئی چندر نگر روڈ، کراچی۔ ای میل:

e@janggroup.com.pksundaymagazin

اس شخص کی بات سن کر چند لمحوں کے لیے تو میں منگک ہی رہ گیا۔ دیار غیر میں گرفتار ہونے والے پھر مشکل ہی سے سلاخوں کے پار آتے ہیں۔ سینٹھ عابد جیسے شخص سے کچھ بھی توقع کی جاسکتی تھی۔ ہو سکتا ہے، اس نے ہمیشہ کے لیے میرا بندوبست کرنے کی غرض سے مجھے جعلی دین اسی لکوا کر دیا ہو؟ میں نے اس کی آنکھوں میں اپنے لیے ایک عجیب سی نفرت دیکھی تھی۔ یہ ویسی نفرت نہیں تھی، جو باقی سب لوگ میری بد صورتی کی وجہ سے مجھ سے محسوس کرتے تھے، یہ عداوت کچھ الگ ہی تھی۔ مجھے یاد ہے، جب میں اپنا دین الگا پاسپورٹ سینٹھ عابد کے دفتر سے اٹھانے کے لیے گیا، تو اس نے عجیب سی نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے کہا تھا۔ ”الغنی تمہاری شاعری کی عاشق ہے۔ سچ پوچھو، تو اگر میں نے تمہیں دیکھ نہ رکھا ہوتا تو ضرور تمہیں اپنے رقیبوں میں شمار کر لیتا۔“ اب میں اسے کیا بتانا کر رقیب ہونا میرا نصیب ہوتا تو پھر بات ہی کیا تھی، مگر بہر حال سینٹھ عابد میرے الفاظ کا رقیب تو تھا اور اس کے لیے اتنی رقابت بھی کافی تھی شاید۔؟ میں چپ چاپ کھڑا اپنی گرفتاری کا انتظار کر رہا تھا کہ اچانک وہ شخص زور سے ہنس پڑا۔ ”او یا راتم تو سنجیدہ ہی ہو گے۔ مجھے پہچانا نہیں۔ رفیق ہوں میں۔ استاد مستانے کا بھانجا۔“ میں نے چونک کر غور سے اسے دوبارہ دیکھا۔ استاد کے بتائے ہوئے حلیے سے تو یک سر مختلف تھا وہ۔ رفیق میری آنکھوں سمجھ گیا۔ ”ارے یار۔۔۔ استاد نے مجھے پندرہ سال پہلے دیکھا تھا، جب میں فیرکا ہوا کرتا تھا۔ ایک کم زور، لاغر اور ناکارہ سامان بسورتا لگا۔ مگر یہ دینی ہے پیارے۔“ اچھے اچھوں کی کایا پلٹ دیتا ہے۔ اب مجھ کی گود کچھ لو۔“ رفیق نے جیب سے اپنی اور استاد کی ایک ساتھ کھنچی ہوئی پرائی بلیک اینڈ وائٹ تصویر نکالی۔ وہ واقعی بہت بدل گیا تھا۔ عربی لباس، اونچا قد، بھرا ہوا جسم اور کھلتی رنگت، کون کہہ سکتا تھا، یہ وہی پرائی بلیک ہے، جو چند سال پہلے پاکستان سے دینی کے اس صحرا میں قسمت آزمائی کے لیے آتا ہوگا۔ میں نے شکایت کی۔ ”بہت اچھا استقبال کیا تم نے، جان ہی نکال کر رکھ دی میری۔“ وہ زور سے ہنسا۔ ”معاف کرنا یاد ادا اپنی پرائی عادت ہے۔ وہی تمہیں اتر پورٹ کے اس کو نے میں جس طرح سبے، ڈرے ہوئے کھڑے تھے، تمہیں دیکھ کر کوئی بھی یہ سوچ سکتا تھا کہ تم غیر قانونی طریقے سے دینی آئے ہو۔“ ہم دونوں گیٹ نمبر 17 کے سامنے والے بڑے ستون کے پاس کھڑے تھے۔ دینی آنے سے پہلے فون پر رفیق کے ساتھ یہی جگہ ٹپکے کے لیے طے ہوئی تھی۔ اتر پورٹ پر ایک نہ ختم ہونے والی میچر تھی، بھانت بھانت کے لوگ، مرد و زن کا ایک سیلاب، جہاں کسی کو کسی کی طرف دیکھنے یا اس پر دھیان دینے کی فرصت ہی نہیں تھی۔ ہر کوئی اپنے آپ میں گم کسی ان جانی منزل کی طرف رواں تھا، مجھے ایک عجیب سا احساس ہوا، خود کو گم کر دینے کے لیے ہمیشہ کسی جنگل یا ویرانے کی ضرورت نہیں ہوتی، انسانوں کا ہجوم بھی خود کو کھودنے کے لیے بڑا کارآمد ثابت ہوتا ہے۔ رفیق میرے منع کرنے کے باوجود میرا سامان اٹھا کر اتر پورٹ سے باہر نکل آیا۔ وہ مجھ سے عمر میں تین چار سال ہی بڑا ہوگا، مگر اس وقت میرے لیے ایک مکمل بزرگ کا روپ دھارے مجھے مختلف قسم کی نصیحتیں کر رہا تھا۔ ”یہاں سے عرب بڑے مغرور اور ارجھ ہیں۔ انہیں خود کو دوسروں سے برتر سمجھنے کا خبط ہے۔ اس لیے ان کے منہ لگنے سے پرہیز کرنا، ورنہ یہ اپنے بندے کا قصور ہوتے ہوئے بھی تمہیں کو خطا وار سمجھیں گے اور اگلے جہاز میں بھا کر واپس پاکستان روانہ کر دیں گے۔ مجھے بھی ایک ٹم ہوگی، ان کے نازخے اٹھاتے اور ان کا خبط برداشت کرتے۔ گالی ان کی زبان پر آتے دیر نہیں لگتی اور اپنے علاوہ دوسری سبھی اقوام کو یہ اپنا خادم تصور کرتے ہیں۔ خاص طور پر ہم مزدور طبقہ لوگوں کو تو ہر مل ان کا غلام بن کر ہی گزارا کرنا پڑتا ہے۔ لہذا دماغ ہمیشہ ٹھنڈا رکھنا۔۔۔۔۔“ رفیق نہ جانے کیا کچھ کہتا رہا اور میں حیرت سے صحرا میں سجے اس شہر کو دیکھتا رہا، جسے دیکھ کر نہ جانے کیوں مجھے پہلی ہی نظر میں یہ احساس ہوا تھا کہ

جیسے چند بدوؤں نے صحرا میں چلتے چلتے کچھ دیر بیکھل قماشے کے لیے اونچی عمارتوں اور کشادہ سڑکوں کا یہ میلہ سجایا ہے۔ ابھی تھوڑی دیر میں شام ہو جائے گی تو وہ اپنے نیموں سمیت یہ نقلی شہر بھی اکھاڑ کر چلے نہیں گے، جیسے ساحل پر کھینچنے والے بچے دن بھر گیلی ریت سے گھروندے بنا کر انہیں خشک کرتے ہیں اور پھر شام کو جب ان کی مائیں واپسی کے لیے آواز لگاتی ہیں، تو جاتے جاتے بیروں سے اپنا ہی بنایا شہر سمار کر کے چلے جاتے ہیں۔ مجھے دینی بھی ایسے چند شرارتی بچے کا بنایا ہوا عارضی بسا شہر لگ رہا تھا۔ رفیق مجھے جس عالی شان اور لمبی سی گاڑی میں لیے چوڑی سڑکوں پر تیزی سے دوڑے جارہا تھا، میں نے اس گاڑی کے ڈیش بورڈ پر ہاتھ پھر کر رفیق سے کہا۔ ”گاڑی تو بڑی کمال ہے، اپنی ہے کیا؟“ رفیق نے زوردار قہقہہ لگایا۔ ”نی اٹال نہیں، مگر ایک دن اپنی بھی ہو جائے گی۔ میرے مالک کی گاڑی ہے یہ۔ ہم تو صرف ڈرائیور ہیں۔ مالک کی ڈرائیوری کر کے روزی روٹی کماتے ہیں۔“ گاڑی مختلف راستوں سے ہوتی ہوئی کسی رانچی علاقے میں داخل ہوگئی، جہاں اونچی اونچی عمارتوں میں بہت سے چھوٹے فلیٹس بھی بنے تھے۔ رفیق اسی علاقے میں رہتا تھا، ہم اس کے چھوٹے سے، مگر صاف ستھرے فلیٹ میں داخل ہوئے، تو اس نے فوراً چائے کا پانی چوبے پر چڑھا دیا۔ ”فرخ میں کھانے پینے کا سامان سامان پڑا ہے۔ کھانا گرم کر کے کھا لیتا۔ مجھے کچھ دیر میں واپس جانا ہوگا۔ مالک سے صرف دو گھنٹے کی چھٹی لے کر آیا ہوں۔ رات باقی باقی ہوں گی۔“

رفیق ایک جھپک چائے کی پوری پیالی دو گھونٹ میں طاق سے اتار کر وہاں سے چلتا بنا۔ بہت کھلے دل کا تھا رفیق، بالکل استاد مستانہ کی طرح..... مجھے وہ سب یاد آئے، تو میں ایک دم اُداس ہو گیا۔ میں نے زندگی میں کبھی گھر سے باہر اور اتنی دُور وقت نہیں گزارا تھا۔ ہم انسان بھی کتنے زور و فراموش ہوتے ہیں، ذرا سی دُوری ہمیں ماضی کا ہر عذاب بھلا کر پھر اُسی ماضی کو یاد کر کے آجیں بھرنے پر مجبور کر دیتی ہے۔ جب میں اپنے گھر میں تھا، تب بھی وہاں میں نے کون سے اچھے دن دیکھے تھے، مگر آج چند ہزار میل کا فاصلہ طے کرتے ہی مجھے اسی گھر اور اپنی گلیوں کی یاد دستانے لگی تھی، جہاں مجھے ہر پل کسی نئی ذلت کا سامنا رہتا تھا۔ جب ایک دن ہمیں یہ سب کچھ چھوڑ ہی جانا ہوتا ہے تو پھر ہم ان درود و یار، رشتوں، درختوں اور آس پاس کے ماحول سے اتنا جوڑ کیوں جاتے ہیں کہ ذرا سی دُوری خود ہمیں توڑ کے رکھ دیتی ہے۔ یہ دنیا اگر عارضی پڑاؤ ہے، تو اپنے ساتھ عارضی پن کا احساس لے کر کیوں نہیں آتی۔

اگلے ایک دو بڑھختے میں رفیق نے بھاگ دوڑ کر کے مجھے ایک تعمیراتی کمپنی کے ذریعے کام پر لگوا دیا، فی الحال میرے پاس تین ماہ کا کام کرنے کا ویزا تھا، مگر رفیق نے وعدہ کیا تھا کہ وہ اپنے مالک سے میری سفارش کروا کر اسے سال بھر کے ویزے میں تبدیل کر دے گا اور اگر میں نے محنت اور ایمان داری سے اپنا کام جاری رکھا تو اس مدت میں سال بہ سال تو سب سے بھی ہوتی رہے گی۔ مجھے ایک زیرِ تعمیر عمارت کی چند ہویں منزل میں ویلڈنگ پلانٹ پر کام کرنے کی مزدوری ملی تھی۔ میں اور رفیق صبح سویرے اپنے اپنے کاموں پر نکل جاتے اور رات گئے واپسی ہوتی تو عام طور پر دونوں ہی تھکن سے اس قدر پُور ہوتے کہ بات کرنا بھی کسی بیماری بوجھ اٹھانے کے مانند لگتا۔ مینے پھر بعد جب مجھے میری پہلی تن خواہی ملی تو آنکھوں سے آنسو نکل آئے، اپنے ملک کی سال بھر کی کمائی سے بھی کچھ زیادہ روپے میرے ٹُٹھی میں بند تھے۔ مگر مجھ نہیں آ رہا تھا کہ میں ان پیسوں کا کروں گا کیا۔ اُس روز رفیق کو بھی تن خواہی ملی تھی، لہذا شام کو اسی خوشی میں وہ مجھے دعائی دکھانے کے لیے اپنے مالک کی گاڑی مالک لایا۔ دعائی کی ذیلی شام میں تبدیل ہوتی رات، رنگ اور نور کی برسات، ہر چہرہ دھلا ہوا، ہر عمارت جگمگاتی سی، چپکتے رستے اور خوشیوں سے سرشار جوڑے، ہانپوں میں ہانپیں ڈالے، اس دل زبا شہر کی ایک اور شام سے زندگی کے جام نشید کرتے خوش نصیب لوگ۔ زندگی صرف سانس لینے کا نام نہیں، اس بات کا احساس مجھے اُس شام ہوا، ہر سانس سے زندگی کی نچوڑ لینے کو جیتا کہتے ہیں، اور ”ہم جیسے مردہ دل کیا خاک جیا کرتے ہیں۔“ رفیق نے مجھے یوں گم سم پیٹھے دیکھا تو چُپ نہ رہ سکا۔ ”کیا بات ہے شہزادے..... کہاں کھو گئے ہو؟ شہر کی رونقیں دیکھو۔“ میں نے فوراً چکر کہا۔ ”ایک تو تم

مجھے شہزادہ نہ کہا کرو، مجھے لگتا ہے، باقی سب کی طرح تم بھی میرا مذاق اڑا رہے ہو۔“ رفیق نے مجھے غور سے دیکھا۔ ”تم تو واقعی برا مان گئے۔ اچھا چلو، میں تمہارا دل بھلانے کے لیے دعائی کے سب سے بڑے کلب لیے چلتا ہوں۔ ویسے تو وہاں کا داخلہ کٹ سی ہم دونوں کی سال بھر کی کمائی سے زیادہ کا ہے، مگر میرے مالک کی وجہ سے ہم سے کوئی ٹکٹ کا نہیں پوچھے گا۔“ میں نے حیرت سے رفیق کو دیکھا۔ ”کیوں تمہارے مالک کی جان پہچان ہے کلب والوں سے؟“ رفیق زور سے ہنس پڑا۔ ”ارے نہیں، وہ کلب بھی میرے مالک ہی کا ہے۔ نہ صرف یہ کلب بلکہ ایسے نہ جانے کتنے کلب اور ہوٹل ہیں میرے مالک کی کمپنی کے پاس۔ کوئی حساب نہیں ہے، اس کی دولت کا۔ کہتے ہیں کہ آج اگر وہ اپنا ہر کام اور کاروبار بند کر کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بھی بیٹھ جائے اور آئندہ ساری زندگی روزانہ لاکھوں درہم اڑاتا رہے، تب بھی اس کی تسلیں ناقیامت عیش کرتی رہیں گی۔“ رفیق اپنے مالک کے بارے میں بتاتا رہا اور گاڑی ساحل کے کنارے دوڑتی ایک عظیم الشان کلب میں داخل ہو گئی۔ میرے لیے یہ سب کچھ ایک ظلم جیسا تھا، مگر منزل عمارت کے لیے ہر منزل پر کار پار لگنا بنائی گئی تھی اور ہر منزل کسی الگ کھیل یا تفریح کے لیے مخصوص تھی۔ عمارت کی لابی اور اندرونی حصوں کو جدید اور خود کار لفٹس کے ذریعے آپس میں جوڑا گیا تھا، عمارت کے اندر ہی ہوٹل، ریسٹوران، سوسائٹنگ پول، گالف اور اسنو کرکلیئر، شاپنگ پلازا، سینما، تھیٹر، جوئے خانے، بار، قمار گاہیں، کیفے اور نہ جانے کیا کیا کچھ آہٹا تھا۔ کلب کیا تھا، پورا ایک شہر تھا، جسے پچاس منزل عمارت میں سمویا گیا تھا۔ چھت پر فٹ بالی نظام اور مختلف سیٹروں اور ستاروں کو دیکھنے والا ایک پورا ہال بنایا گیا تھا، جہاں بڑی بڑی دیوید کھل دور بینوں کے ذریعے چاند ستاروں کا معائنہ کیا جاسکتا تھا، کلب میں نو جوان جوڑوں کی بہتات تھی، جب دربارے پڑے تو ہجوم کد تل دھرنے کو جگہ نہ تھی، جوئے خانوں اور بڑے کیسینو کے باہر انتظار کرنے والوں کی لمبی قطاریں ہاتھ میں نوکن لیے کھڑی تھیں۔ میں نے رفیق سے جب اپنی اس حیرت کا اظہار کیا کہ یہ کلب تو کسی طور ایک اسلامی ملک کا حصہ نہیں لگ رہا تو رفیق نے حسبِ معمول ایک جان دار قبیلہ لگایا اور سر جھٹک کر بولا۔ ”اسلامی ملکوں میں کلب نہیں ہوا کرتے۔ دعائی ایک الگ ہی شہر ہے۔ یہاں تمہیں ہر مذہب کا پیروکار ملے گا۔ اب یہ اس پیروکار کی مرضی ہے کہ وہ اپنے مذہب کو کس حد تک برتاوے۔ عابدوں اور زاہدوں کے لیے مسجدیں گھٹی ہیں اور رندوں کے لیے شراب خانے، وہ کہتے ہیں ناں۔“ ”زندہ کے رند رہے، ہاتھ سے خست نہ گئی۔“ تو بس وہی معاملہ یہاں بھی ہے۔“ کلب کی ہر منزل پر خشن کے جلوے اس کثرت سے بکھرے تھے کہ انہیں اپنی محدود بصارت میں سمیٹنا کسی بھی انسان کے لیے ناممکن تھا۔ رفیق مجھے کیسینو کے اندر لے گیا اور میں وہاں پیسے کی ریل بیلن کیچہرے پر گھبرا اُٹھی۔ مذہب انسان کو جس چیز سے منع کرتا ہے، جانے اُسی عمل میں انسان کو اتنی کشش کیوں محسوس ہوتی ہے؟ شاید گناہ اور ثواب کا بنیادی فلسفہ ہی یہی ہے اور اسی جبر پر سزا و جزا کا دار و مدار۔ مگر فی الحال تو اس کلب میں لوگ پانسے پیچک رہے تھے اور قمار بازی کے نشے میں مسرور سزا و جزا کا ہر فلسفہ بھلا کر بس ان لٹکوں کو جی رہے تھے، جو انہیں میسر تھے۔ مسئلہ تو مجھ جیسوں کا تھا، جو گناہ کرتے وقت ثواب کی طرح کھجوری کر جاتے ہیں اور کارِ ثواب بھی ڈر کر کسی گناہ کی طرح کرتے ہیں۔

ہم کیسینو سے باہر نکل رہے تھے کہ ایک کلب میں ایک اہل چلی سی لڑکی۔ سارا عملہ ایک دم چاقو بنو بند ہو گیا اور محافظوں کی دوڑیں لگ گئیں، پنا چلا کہ کلب کا مالک اور رفیق کا آقا بہرود کریم وہاں آچکا ہے۔ میں بھی رفیق اور باقی سارے نوکروں کے ساتھ ایک جانب قطار میں کھڑا ہو گیا۔ بہرود ہال میں داخل ہوا تو چاروں طرف سنا سنا سنا چھا گیا۔ وہ ذلیق عمارت کا ایک نفیس سا شخص تھا۔ مغربی لباس میں ملیں، ہاتھ میں ہوانا کا قبضہ سیگار، میرے سے بڑی نائی بن اور کف لکس، امریکی ڈیزائنر سوٹ اور پیچنگ جوتے، آنکھوں میں ایک عجیب سی وحشت اور آدھی، کھو یا کھو یا سا وہ شخص ذاتی کسی عظیم سلطنت کا



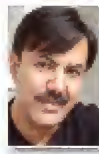
سلطان ہی لگ رہا تھا۔ جیسے دولت ہر کسی کو راس نہیں آتی، ویسے ہی امیری بھی ہر کسی کے ساتھ نہیں چلتی، میں نے بہت سے امیروں کو فقیروں سے بدرخصیت لیے پھرتے دیکھا تھا، مگر بہروز کریم پر امارتِ نوبت کر رہی تھی، اس کے ارد گرد اسٹاف، منیجرز اور محافظوں کا ایک جھوم تھا، مگر پھر بھی وہ گلاب کے نوکروں کے سلام کا جواب خشنہ پیشانی سے دیتے ہوئے آگے بڑھتا رہا۔ رفیق نے مجھے بتایا کہ جس رات بہروز اپنے کسی ہوٹل یا کلب کا دورہ کرتا ہے، وہ رات وہاں کے عملے کے لیے شبِ برأت بن جاتی ہے، کیوں کہ اس رات ان سب کو ایک ماہ کی تنخواہ کے برابر پونس ملتا ہے اور اس مخصوص کلب کی ہر منزل پر موجود بھی افراد بہروز کے مہمانوں کے طور پر برتے جاتے ہیں، ان کا ہر مل، ہر خرچہ بہروز کی طرف سے ادا کیا جاتا ہے۔ گویا سبھی کے لیے دعوتِ عام ہوتی ہے۔ میں حیرت سے رفیق کی یہ ساری رام کہانی منہ کھولے سن رہا تھا کہ اچانک بہروز ہمارے قریب سے گزرا تو رفیق نے جلدی سے اسے سلام کیا۔ بہروز نے مسکرا کر جواب دیا تو رفیق نے موقعِ غنیمت جان کر تیزی سے میرا ہاتھ پکڑ لیا، کھینچ کر قہقار میں آگے کر دیا۔ ”یہ میرا دوست بڑی زاوہ مالک..... کچھ دن پہلے ہی پاکستان سے آیا ہے یہاں مزدوری کے لیے۔ اس کا سلام بھی قبول کیجیے۔“ بہروز نے مسکرا کر میری طرف دیکھا۔ ”کیا تم بتایا تم نے.....؟“ میں پُچھ رہا، رفیق نے جلدی سے میرا نام دہرایا۔ ”بڑی زاد مالک۔“ بہروز کی مسکراہٹ گہری ہو گئی۔ ”خوب، اسے کام نہ ملے تو فیکٹری کے منیجر مصطفیٰ کے پاس بھیج دیتا۔“ بہروز مختصر سی بات کر کے آگے بڑھ گیا اور میں حیرت سے رفیق کو دیکھتا رہا۔ ”تمہارا مالک تو اردو بول لیتا ہے۔“ رفیق نے ہنس کر جواب دیا۔ ”دعنی میں کبھی عربی نہیں بولتے۔ میرے مالک ہندوستانی مسلمان ہیں۔ تقسیم کے بعد ان کے والدین یہاں دعنی آ کر بس گئے تھے، ہم پاکستانی اور ہندوستانی نوکروں سے وادہ میں بات کرتے ہیں۔“

کلب سے واپسی پر رفیق مجھے بہروز کریم کی کامیابیوں کی داستانیں سناتا رہا کہ کیسے کامیابی کی سیڑھیاں طے کرتے کرتے آج وہ دعنی کے بزنس ورلڈ کے آسمان کا تارہ بن چکا ہے۔ بہروز کریم کی اس افسانوی کامیابی سے متعلق بہت سی بڑی اسرار کہانیاں بھی مشہور تھیں، مثلاً یہ کہ وہ اپنے دشمنوں کو کبھی معاف نہیں کرتا اور اس کے اس وجہ پیرے کے پیچھے ایک سٹاک شخص ٹھہرا ہوا ہے، جو اپنی کامیابی کی راوی میں آنے والی ہر شے کو تپس نہیں کر دیتا ہے۔ رفیق، بہروز کے بارے میں بولتے بولتے اچانک اسٹیرنگ پر ہاتھ مار کر زور سے ہنس پڑا۔ ”دیکھ لو بڑی زادے پیارے..... تمہیں جس نام سے اتنی چو ہے، آج وہی نام میرے مالک سے تمہارے تعارف کا سبب بن گیا۔ ورنہ بہروز صاحب نے آج تک کسی کا نام پلٹ کر وہ بارہ نہیں پوچھا۔ وہ کہتے ہیں نا..... خدا نے دنیا میں ہر چھوٹی سے چھوٹی چیز کا بھی کوئی مقصد ضرور رکھا ہے، تو بھائی مجھے تو تمہارے نام کا مقصد آج صاف نظر آ رہا ہے۔“ مگر بچنے کے بعد بھی ساری رات میں بہروز کریم کے بارے میں سوچتا رہا کہ کوئی انسان آخر اتنی بے تحاشا دولت کا کیا کرتا ہوگا۔ دولت مندوں کے دن بھی تو ہم غریبوں کی طرح چوبیس گھنٹے ہی کے ہوتے ہیں۔ وہ بھی ہماری طرح سوتے جاگتے ہیں، تو پھر باقی بچے ہوئے چند گھنٹوں کے لیے کسی کے پاس قارون کا خزانہ اور کسی کے ہاتھ خالی سگلول کیوں ہوتا ہے۔

اگلے دن رفیق مجھے فیکٹری امپاء میں لے گیا۔ منیجر مصطفیٰ ایک سخت گیر اور اکٹھ مزاج مصری تھا۔ جو سوائے کام کی بات کے، دوسری کوئی بات کرنا پسند نہیں کرتا تھا۔ اس نے رفیق کو سر سے نیچ تک گھورا اور دعنی میں کچھ کہا۔ اتنے سالوں میں یہاں رہتے رہتے رفیق کی عربی بھی کافی رواں ہو چکی تھی۔ رفیق نے عربی ہی میں میری طرف اشارہ کر کے کچھ کہا۔ مصطفیٰ نے میرے کاغذات طلب کیے اور پانچ منٹ بعد ہی ہم اس کے کمرے کے باہر کھڑے تھے۔ رفیق نے میرے کاندھے پر ہاتھ مار کر کہا۔ ”جمل پیارے..... حیرا کام تو بن گیا۔ یہ منیجر تھوڑا سائیڈ حا آدمی ہے، مگر ہے مالک کا خاص بندہ۔ اب یہ تمہارے سارے انتظامات یوں چلنے بجائے میں کر دے گا۔ میں نے اسے مالک کا حکم پہنچا دیا ہے۔“ اس دن مجھے ایک اور بات پتا چلی کہ بہروز کریم کی سلطنت میں تو سیکڑوں ایسی گاڑیاں ہیں، جیسی ایک رفیق چلاتا ہے۔ خوش قسمتی سے رفیق کچھ عرصے تک بہروز کریم کے ذاتی دفتر کی گاڑی چلاتا رہا تھا، اس لیے بہروز کو رفیق کا چہرہ یاد رہ گیا ہوگا۔ پانچ روز بعد رفیق نے مصطفیٰ کا دستخط شدہ، فیکٹری کا ایک حکم نامہ میرے ہاتھ میں تھا دیا۔ مجھے خاصی معقول تنخواہ پر فیکٹری کی رات کی شفٹ میں کام پر لگا دیا گیا تھا۔ کام کچھ مشکل نہیں تھا۔ بس لوہے اور دیگر خام مال کا کمپیوٹر میں اندراج کرنا اور سپلائی کے وقت چارٹ بنانا تھا۔ میں رات بھر فیکٹری میں ڈیوٹی دے کر صبح گھر واپس پہنچتا تو رفیق جانے کی تیاری میں ہوتا۔ ہم ایک ساتھ چائے کا ایک ایک کپ حلق سے پیچے اٹھ بیٹے اور تین سوٹوں کے لیے اپنے کمرے کی جانب بڑھ جاتا۔ میری راتیں جاگتے اور دن سونے لگے تھے، اُن دنوں مجھے ایک عجیب سا احساس ہوا کہ رات کو انسان کی شخصیت یک سر بدل جاتی ہے، دن کا اُنہاں ہماری بہت سی اُن دیکھی صلاحیتوں کو خوابیدہ کر دیتا ہے، جب کہ شام ڈھلنے کے بعد ہم زیادہ رومان پرور، شفاف اور کسی حد تک نڈر بھی ہو جاتے ہیں یا شاید مختلف شخصیات پر اس دن اور رات کے عہد کا کچھ مختلف اثر ہوتا ہوگا۔

میں فیکٹری میں اپنا کام رات کے پہلے پہری میں مکمل کر لیتا تھا۔ پھر میں ہوتا اور صبح کارٹوں بھرا آسمان، جودرات بھر مجھ سے باتیں کرتا۔ میں گھر سے آئے خطوں کا جواب نہیں دیتا تھا، البتہ ہر ماہ ایک معقول رقم انہیں ضرور بھیج دیتا تھا۔ اس رات بھی میں گھر سے آئے ایک خط دیکھ رہا تھا کہ فیکٹری کے پچھلے حصے میں کچھ کھٹ پٹ کی آوازیں سنائی دیں۔ میں تیزی سے پیچھے کی جانب لپکا۔ چند پرانے مزدور کچھ لوہے کی بیٹیاں ایک گودام میں منجبال کر رکھ رہے تھے۔ میں نے ان سے تفصیل پوچھنا چاہی تو نورمین نے مجھے جھڑک دیا۔ مگر نہیں خاموش بیٹھنے والا نہیں تھا۔ میں نے سمجھ لیا کہ اگر انہوں نے مجھے تفصیل نہ بتائی، تو میں صبح ہوتے ہی منیجر مصطفیٰ کو اطلاع دے دوں گا۔ اتنے میں پیچھے سے مصطفیٰ کی آواز آئی۔ ”میں یہیں ہوں..... تمہیں کچھ بتانے کی ضرورت نہیں، اور آج تو تمہارا آف تھا۔ تم یہاں کیا کر رہے ہو؟“ سچ تو یہ ہے کہ مصطفیٰ کو وہاں دیکھ کر میں پریشان ہو گیا تھا۔ آج واقعی میری چھٹی تھی۔ مگر ایک ساتھی کے بیمار ہونے کی وجہ سے مجھے اچانک ڈیوٹی پر آنا پڑا۔ میں نے مصطفیٰ کو بتایا کہ شفٹ انچارج کے طور پر یہ میری ڈیوٹی ہے کہ میں ہر چیز کا باقاعدہ اندراج کروں۔ مصطفیٰ نے میری بات لا پرواہی سے ٹال دی۔ ”ٹھیک ہے، تم نے اپنا فرض پورا کیا۔ اب تمہارے انچارج کی حیثیت سے میں تمہیں حکم دے رہا ہوں کہ تم واپس اپنی جگہ پر جا کر بیٹھ جاؤ اور خاموشی سے اپنی شفٹ ختم کر کے پچ چاپ واپس گھر چلے جاؤ۔“ مصطفیٰ کی آواز کھردری اور لہجہ بہت سخت تھا۔ میں نے اُس وقت ان سب سے بحث کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ مگر میں نے سوچ لیا تھا کہ کسی بھی طرح بہروز کریم تک یہ اطلاع ضرور پہنچاؤں گا۔ چاہے اس کا انہماک کچھ بھی ہو۔ بہروز شفت میں ایک آدھ بار اس فیکٹری کا دورہ بھی کرتا تھا اور پھر پھٹنی رات جب میں نے احاطے کے باہر بہروز کریم کے اسکوڈ کی گاڑیوں کو رکتے دیکھا، تو حیرتی سے ہال کے گیٹ پر آ کر کھڑا ہو گیا۔ مصطفیٰ بھی بہروز کے ساتھ ساتھ چلتا ہوا اسے کام کے بارے میں کچھ تفصیلات بتاتا تھا۔ مجھے راستے میں کھڑے دیکھ کر مصطفیٰ کچھ پریشان سا ہو گیا تھا۔ جب وہ لوگ راہ داری میں میرے قریب سے گزرے تو میں نے اچانک آگے بڑھ کر بہروز کریم کو براہِ راست مخاطب کر کے کہا۔ ”مجھے آپ سے کچھ ضروری بات کرنی ہے سر!.....“ بہروز نے پلٹ کر میری طرف دیکھا۔ اس کی پیشانی پر ہل بڑھ گئے تھے۔

(جاری ہے)



## .....ہاشم ندیم.....

ہاشم ندیم نو جوان نسل کے پسندیدہ، نملک کے معروف و منفرد رمانا رائٹر، ناول نگار ہیں۔ ان کے ناول ”خدا اور محبت“ اور ”بچپن کا دبیز“ نے بین الاقوامی پذیرائی حاصل کی، تو جنگ، سنڈے میگزین میں شائع ہونے والے ناول ”عبداللہ“ کو بھی وقت کے پسندیدہ ترین ناول کا درجہ حاصل ہوا۔ انہیں ان کی ادبی خدمات پر حکومت پاکستان نے تمغہ حسن کارکردگی سے نوازا۔ نیز، قلم کے شعبے میں ”عبداللہ“ نامی ایک بین الاقوامی قلم کے تخلیق کار کی حیثیت سے بھی قدم رکھ چکے ہیں۔

”پری زاو“ ایک اچھوتے، حساس اور قدرے مشکل موضوع پر مبنی بہت دل گداز سی تحریر ہے، یہ ایک ایسے شخص کی کہتا ہے، جسے اک کم صورتی کے عیب کے سبب اس ظاہر پسند، زر پرست دنیا کے آن گشت بد صورت رویوں، بد ہیئت آنکھوں کا سامنا کرنا پڑا۔ ناول سے متعلق اپنی آراء سے آگاہ کرنا ہرگز مست ہو لیے گا۔ ہمارا چاہ وہی پرانا ہے:

ایڈیٹر ”سنڈے میگزین“ روزنامہ جنگ، شعبہ میگزین، اخبار منزل، آئی آئی چندر گھر روڈ، کراچی۔ ای میل:

[sundaymagazine@janggroup.com.pk](mailto:sundaymagazine@janggroup.com.pk)

مصطفیٰ نے مجھے نئی طرح سمجھا دیا۔ ”تمہیں کسی نے بتایا نہیں کہ مالک بہروز کو آج تک کسی نے یوں بچا راستے میں نہیں روکا، میں تمہیں اسی وقت نوکری سے فارغ کرتا ہوں۔ دفعہ ہوا جو وہاں سے، کل آکر مینے بھری تنخواہ لے جانا۔“ میں نے اطمینان سے مصطفیٰ کی بات سنی۔ ”ٹھیک ہے، میں چلا جاؤں گا۔ مگر مجھے ایک بار مالک سے بات کرنی ہے، یہ بہت ضروری ہے۔“ اس پاس کا محلہ وحشت زدہ سا مجھے یوں گھور رہا تھا، جیسے مجھ سے بڑا احمق انہوں نے اس روئے زمین پر پہلے کبھی نہ دیکھا ہو۔ بہروز نے اطمینان سے اپنا سر اٹھا دیا۔ ”ہاں بولو لڑکے..... اگر تمہیں پیسے وغیرہ چاہئیں، تو تم نے واقعی میرا بہت وقت ضائع کیا، اکاؤنٹس والوں سے لے لو۔“ میں نے جلدی سے واضح کیا۔ ”نہیں جناب..... مجھے پیسے نہیں چاہئیں، میں آپ کو کچھ بتانا چاہتا ہوں۔ یہاں اس فیکٹری سے کچھ ایسی ترسیلات بھی ہوتی ہیں، جن کا ریکارڈ نہیں رکھا جاتا۔ میں نے کوشش کی تو مجھے بھی منع کر دیا گیا۔“ میری بات سن کر مصطفیٰ نے ذانت کر کچھ کہنے کی کوشش کی، مگر بہروز نے ہاتھ اٹھا کر اسے منع کر دیا اور اپنے خاص محافظ فیروز سے کہا۔ ”فیروز خان کچھ دیر بعد اس لڑکے کو میرے دفتر لے آؤ۔“ بہروز حسب معمول مختصر سی بات کر کے وہاں سے آگے بڑھ گیا۔ فیروز نے مجھے گھور کر دیکھا۔ اسے بہروز کے بہت قریب سمجھا جاتا تھا اور وہی بہروز کا محافظ خاص بھی تھا۔ اس کے علاوہ بہروز کسی دوسرے ہاؤس گارڈ پر اتنا بھروسہ نہیں کرتا تھا۔ فیروز خان ہی اس کی خواب گاہ کے باہر بھی پہرہ دیتا تھا۔ یہ سب کچھ مجھے رفیق پہلے ہی بتا چکا تھا۔ میں نے جب بھی فیروز کو دیکھا، اسے خاموشی یا پناہ شاید اسے بھی اپنے مالک بہروز کریم کی طرح زیادہ بات کرنے کی عادت نہیں تھی۔ رات کی وحشت کے تمام ملازم فیروز کے ایک اشارے پر وہ بارہ اپنے اپنے کام میں بٹ گئے۔ کچھ دیر بعد چڑا سی نے آکر فیروز کو بتایا کہ مالک مجھے طلب کر رہے ہیں۔ فیروز نے مجھے آگے بڑھنے کا اشارہ کیا اور ہم دونوں بہروز کے جہازی سائز، عالی شان دفتر میں داخل ہو گئے۔ مصطفیٰ بھی کمرے میں موجود تھا، جانے اس نے میرے بارے میں مالک کو کیا بتایا ہوگا۔ بہروز کریم کے چہرے پر حسب معمول سپاٹ سا تاثر تھا، اس نے غور سے میری طرف دیکھا۔ ”تم تو وہی ہوتا، جسے رفیق نے بھرتی کر دیا تھا؟ ہاں کہو، کیا کہنا چاہتے ہو.....؟“ میں نے اس رات کا پورا قصہ بہروز کو سنایا۔ وہ اطمینان سے بیٹھا سگڑ کے کش لیتا میری بات سن رہا۔ میری بات ختم ہوئی، تو اس نے ایک گہرا کش لے کر میری طرف غور سے دیکھا۔ ”تم جانتے ہو کہ اگر تمہارا لگا ہوا یہ الزام غلط ثابت ہوا تو نہ صرف تمہاری نوکری جائے گی بلکہ تمہیں غلط بیانی کے الزام میں پولیس کے حوالے بھی کیا جاسکتا ہے۔“ جی..... میں جانتا ہوں، آپ اپنے طور پر قصہ بھی کر دیا کرتے ہیں۔“ بہروز کریم نے پلٹ کر اپنے عتب میں مژدہ کھڑے مصطفیٰ سے براہ راست پوچھا۔ ”کیوں مصطفیٰ! کیا یہ لڑکا بچ کر رہا ہے؟“ مصطفیٰ نے ایک لمحہ توقف کر کے میری طرف دیکھا اور پھر دھیرے سے بولا۔ ”جی مالک..... یہ سچ کہہ رہا ہے۔“ میں نے چونک کر مصطفیٰ کی طرف دیکھا، اس کا جواب میری توقع کے بالکل برعکس تھا اور اس سے بھی زیادہ حیرت بہروز کریم کا رد عمل دیکھ کر ہوئی۔ اس نے اطمینان سے سگڑ کا ایک اور لمبا کش لیا اور مصطفیٰ سے کہا۔ ”ٹھیک ہے مصطفیٰ جاتے ہوئے میرے لیے ایک کپ بلیک کافی کا کہتے جانا۔“ بہروز کو میرا خیال آیا۔ ”لڑکے، تم کافی پیو گے.....؟“ میں نے جلدی سے انکار میں سر ہلایا۔ مصطفیٰ کمرے سے جا چکا تھا۔ میں نے بھی واپسی کے لیے دروازے کا رخ کیا کہ بہروز نے مجھے آواز دے کر روک لیا۔ ”مصطفیٰ میرا خاص آدمی ہے۔ میرے وفاداروں میں سے ایک قریبی وفادار لیکن مجھے اچھا لگا کہ ابھی وفاداری کی یہ نایاب صنف دنیا سے بالکل ہی ناپید نہیں ہوئی۔ تم نے اپنی نوکری کی پروا کیے بٹ اپنی وفاداری بھائی۔“ میرے ذہن سے تمہارا نام نکل گیا۔ بڑا منفرد سا نام تھا.....؟ بہروز نے ذہن پر زور ڈالتے ہوئے میری طرف دیکھا۔ میں نے دھیرے سے اپنا نام دہرایا۔ ”پری زاو“ بہروز مسکرایا۔ ”ہاں..... پری زاو! میں نے اس دن بھی محسوس کیا تھا کہ تمہیں اپنا نام کچھ خاص پسند نہیں، تو پھر تم یہ نام بدل کیوں نہیں لیتے.....؟“ میں نے بہروز کی طرف دیکھا۔ ”نام بدلنے سے قسمت تو نہیں بدل جائے گی مالک..... ویسے بھی یہ نام مجھے میری اوقات یاد دلانا رہتا ہے۔“ بہروز نے میری آنکھوں میں جھانکا۔ ”مرد کو اتنا حساس نہیں ہونا چاہیے، دینی کس لیے آئے ہو؟“ میرے منہ سے بے اختیار نکلا۔ ”بہت سا پیسا کمانے..... آپ کی طرح بہت بڑا آدمی بننے۔“ بہروز کے ہونٹوں پر ایک تلخی مسکراہٹ مجھے بھر کو جھلک دکھا کر غائب ہو گئی۔ ”بڑا آدمی.....؟ جانتے ہو لڑکے، یہ میری طرح کے جو بڑے لوگ تمہیں دولت اور ترقی کے آسمان پر چمکتے نظر آتے ہیں، ان سب کو بھی زندگی میں ایک نہ ایک بار تمہاری طرح ایک رات کسی غیر قانونی ترسیل کا پتا چلا ہوتا ہے، فرق صرف اتنا ہے کہ وہ اس کی خبر دینے کے بجائے، اس آلودہ نظام کا حصہ بننے کا فیصلہ کر لیتے ہیں۔“ بہروز کریم اپنی بات ختم کر کے کھڑا ہو گیا اور



باہر جاتے ہوئے لئے بھر کے لیے میرے پاس زکا۔ ”گھر جانے سے پہلے اکاؤنٹ سے ملے جانا۔۔۔۔۔“ میں اپنی جگہ ٹھم سا کھڑا رہ گیا اور بہرہ ور کرنے سے نکل گیا۔ صبح بھٹکی سے پہلے فیکٹری کا اکاؤنٹ میرے پاس آیا اور ایک نوٹوں سے بھرا لفافہ میرے ہاتھ میں چھما گیا۔ اس روز مجھے پہلی بار پتا چلا کہ بہرہ ور کریم کی اس سلطنت کا اصل دار و مدار کچھ ایسے ہی غیر قانونی دھندوں پر ہے، جن کی خبر باہر والوں کو نہیں۔

رفیق کو جب اس سارے معاملے کا پتا چلا تو وہ مجھ پر بڑی طرح برس پڑا کہ آخر مجھے ان کے پھدے میں ناگ اڑانے کی ضرورت ہی کیا تھی۔ اس نے مجھے خبردار کیا کہ ایک بار تو بہرہ ور نے مجھے معاف کر دیا، مگر دوبارہ اگر کبھی ایسا کچھ ہوا تو وہ میرے ساتھ کوئی رعایت نہیں برتے گا۔ مگر نہ جانے کیوں مجھے دوسرے عملے کے برعکس، بہرہ ور کریم سے بالکل بھی خوف محسوس نہیں ہوتا تھا۔ اگلے جتنے میری ڈیوٹی رات کے بجائے دن کی شفٹ سے تبدیل کر دی گئی۔ مصطفیٰ سے اب بھی میرا گہے بہا ہے سامنا ہوتا رہتا، مگر اب اس کے لہجے اور تیور میں وہ پہلے جتنی سختی نہیں رہی تھی۔ اور پھر کچھ دن گزرنے کے بعد ایک شام جب میں فیکٹری سے باہر نکلنے سے پہلے اپنے برقی کارڈ کو ذریعہ واپسی کا وقت نوٹ کر وار ہاتھ، تب اچانک رات کی شفٹ والے کارکن نے مجھے مصطفیٰ کا بیٹا دیا کہ اس نے مجھے مل کر جانے کو کہا ہے۔ میں وہیں گیٹ کے قریب ایک شید کے نیچے مصطفیٰ کا انتظار کرنے لگا۔ مغرب کے بعد مصطفیٰ اپنے محافظوں کے ساتھ وہاں پہنچا اور گاڑی سے اترتے ہی مجھے اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔ اندر کمرے میں داخل ہونے کے بعد اس نے مجھے کئی لگانے کا اشارہ دیا اور اپنے مخصوص کشت لہجے میں بولا۔ ”جتنا کمار ہے، اس پر اکتفا کرنا چاہتے ہو یا پھر کم وقت میں کچھ زیادہ بنانے کی ہمت رکھتے ہو۔۔۔۔۔؟“ میرا جواب بہت سیدھا تھا۔ ”میرے پاس کھونے کے لیے کچھ خاص نہیں اور میں اپنی ہمت آزمانا چاہتا ہوں۔“ مصطفیٰ نے لمبی بات نہیں کی۔ بس اتنا کہا کہ رات کو ساحل پر کچھ لالچوں پر سامان آئے گا۔ مجھے وہ سامان وصول کر کے بہرہ ور کی ایک دوسری فیکٹری کے گورام تک پہنچانا ہوگا۔ اس کام میں میرے ساتھ چند دوسرے معاون مع چار گاڑیوں اور ڈرائیورز موجود ہوں گے۔ میں نے زیادہ تفصیل میں جانے بنا ہی بھری۔ مصطفیٰ نے میرا کاندھا تھپتھپایا۔ ”کام مشکل ہے، مگر یاد رکھو، کام یابی ہمیشہ بہادر کا ساتھ دیتی ہے۔ تمہیں یہ سب کچھ قانون کی نظر سے بچ کر کرنا ہوگا اور گرفتاری کی صورت میں تمہارا مالک سے کوئی تعلق ظاہر نہیں ہونا چاہیے۔ امید ہے تم کچھ کئے ہو گے۔“ میں نے سر ہلایا۔ ”آپ بے فکر رہیں، میری زبان ہمیشہ بند رہے گی۔“

رات ڈھلتے ہی ہم آٹھ لوگ چار بڑی بھینوں میں سوار ڈور دراز کے ایک ویران ساحل پر پہنچ گئے۔ سمندر خاموش اور آسمان تاریک تھا۔ ہم سب اندھیرے میں ایک بڑی چٹان کی اوٹ میں گاڑیاں کھڑی کر کے لالچوں کا انتظار کرنے لگے۔ میرے لیے وہ سات کارندے بالکل اجنبی تھے اور ہم میں سے کوئی بھی آپس میں بات نہیں کر رہا تھا۔ ڈور کہیں سمندر میں لنگر انداز جہاز سے موسیقی اور نو جوان جوڑوں کے گانے بجانے کی آوازیں ہوا کے دوش پر چند لمحوں کے لیے فضا میں کھنکھرتا تھا اور پھر وہ طویل ستانا ہمیں گھیر لیتا۔ 14 فروری کا دن تھا، جسے ساری دنیا میں محبت کے دن کے طور پر منایا جاتا ہے۔ جب میں فلیٹ سے نکل کر ڈیوٹی کے لیے فیکٹری کی طرف آ رہا تھا تو میں نے دہلی کے دو دو یار، ہزار اور سڑکوں کو سرخ اور سفید رنگ کے غباروں اور پھولوں سے اٹنے دیکھا تھا، نو جوان لڑکیاں سرخ لباس میں ادھر ادھر رنگ بدلتی تکیوں کی طرح ڈنٹی پھر رہی تھیں اور نو جوان سیاہ لباس کے ساتھ گلے میں سرخ اسکارف باٹائی پہنے محبت کا دن منانے کی تیاریوں میں مصروف تھے۔ شاید سمندر میں لنگر انداز جہاز میں بھی ویلنٹائن کی پارٹی جاری تھی۔ کاش! دنیا میں بد صورت لوگوں کا بھی کوئی ویلنٹائن ڈے منایا جاتا۔ یہ ہر تقریب اور تہوار جو محبت سے منسوب ہے، اس پر صرف خوب صورت لوگوں ہی کا قبضہ کیوں جما رہتا ہے۔ اگر خوب صورت لوگ محبت کا دن مناتے ہیں، تو ہم جیسوں کو بھی کوئی نفرت کا دن منانے کی اجازت نہ ہوتی چاہے، کچھ تو ایسا ہو، جو ہم سے بھی منسوب ہو۔ میں جانے کن انہی سیدی سوچوں کے حضور میں گھر اٹھا کہ اچانک دور سے چند لالچوں کی مخصوص جلتی بھتی روشنی نظر آنے لگیں۔ شاید یہ کوئی سنگٹل یا خاص اشارہ تھا، جو پہلے سے ساحل والوں کے لیے طے شدہ تھا۔ ہم سب ہوشیار ہو گئے۔ میری گاڑی کے ڈرائیور نے ڈیش بورڈ کھول کر اس میں سے پائل نکال کر میرے حوالے کر دیا۔ میں اسے یہ بھی نہ کہہ سکا کہ مجھے اس کا استعمال نہیں آتا، کچھ دیر میں لالچیں ساحل کے قریب آئیں اور ہم سب گاڑیوں سے اتر کر لالچوں کی طرف بڑھے۔ لالچیں ساحل سے لگ چکی تھیں اور ہم ابھی چند قدم کے فاصلے پر تھے کہ اچانک ساحل کا وہ دیرانہ حصہ بڑی بڑی دیو پیکل سرخ لائنس کی روشنیوں میں جھلک سا گیا اور ہم سب پل بھر میں اس تیز روشنی میں نہا گئے۔ کوئی لاؤڈ اسپیکر پر زور سے اگھر یزی میں چلتا یا۔ ”کوئی بھی اپنی جگہ سے ہلنے کی کوشش نہ کرے، تم سب کو چاروں طرف سے گھیر لیا گیا ہے۔“ مجھے کچھ سمجھ نہیں آیا کہ یہ سب ہو کیا رہا ہے، پھر ہمارے ساتھیوں میں سے کوئی چلتا یا۔ ”بھاگو“ اور اس کے ساتھ ہی ہماری طرف سے تین چار فائر ہوئے اور سرخ لائنس چمکا کے سے نوٹ گئیں۔ ایک بھگدڑی بچہ گئی، تیز روشنی کے بعد ایک دم چھا جانے والا اندھیرا عام اندھیرے سے زیادہ سیاہ اور گہرا ہوتا ہے۔ لہذا ہم سب اندھیرے میں گرتے پڑتے اپنی گاڑیوں کی طرف بھاگے، مگر مجھے راستے میں ایک ٹھوکر لگی اور اگلے ہی لمحے میں گیلی ریت پر اوندھے منہ گر رہا تھا۔ لوہے کی ایک سرد نال میری کنپٹی سے ٹکرائی اور کسی نے پوری قوت سے میرے سر پر پتول کا دست مارا۔ اندھیرے کا طوفان میری آنکھوں کی پٹیوں سے ہوتا دماغ کی رگوں میں اتر گیا اور میرے وجود پر موت جیسا سکوت طاری ہو گیا۔ بے ہوشی، شاید نیند کی انتہا ہے اور نیند موت کا ایک چھوٹا وقفہ ہوتی ہے۔

میں بھی کسی ایسے ہی وقفے کے درمیان موت کی صلیب پر لٹک رہا تھا، جب شدید غصہ سے پانی کی ایک بو چھانے مجھے کھینچ کر اس صلیب سے نیچے اتار اچھیکا۔ پانی کے دوسرے ریلے کے ساتھ ہی میں ایک جھٹکے سے واپس ہوش کی دنیا میں لوٹ آیا۔ میرے ہاتھ پاؤں کسی کھردری رسی کے ساتھ اس قدر مضبوطی سے ایک کرسی کے ساتھ باندھے گئے تھے کہ مجھے وہ خاردار تاریکی رسی اپنے ہاتھوں کی کالائوں اور پاؤں کے ٹٹوں میں کھینچتی محسوس ہو رہی تھی،

مجھے کرسی پر بٹھا کر میری گردن بھی رستی سے لپیٹ کر کرسی کی پشت سے اس طرح کس کر باندھ گئی تھی کہ میری ذرا سی جنبش سے دوسری گردن کے گوشت میں جھجست ہوتی جا رہی تھی۔ وہ ایک اندھیرا سا کمرہ شاید تہہ خانہ تھا۔ میں نے کچھ ہولنے کی کوشش کی، مگر میری آواز میرے گلے ہی میں گھٹ کر رہ گئی۔ کچھ دیر میں، میرے عقب میں چند لوگوں کے قدموں کی آہٹ ہوئی اور کسی نے سامنے آ کر میرے چہرے پر ایک زوردار طمانچا مسد کیا اور عربی میں چلا کر کچھ پوچھا۔ پھر میرے جواب دینے سے پہلے ہی دوسرا طمانچا کال پر اپنے نشان ثبت کر گیا۔ میں نے چلا کر کہا کہ میں عربی نہیں بول سکتا، لہذا وہ جو کوئی بھی ہیں، مجھ سے انگریزی میں بات کریں۔ اس بار دو تین اندھیرے سے نکل کر سامنے آ گئے۔ وہ شاید پولیس یا کوئی دوسرے قانون نافذ کرنے والے ادارے کے اہل کار تھے۔ اس بار انہوں نے رابطے کے لیے انگریزی کا سہارا لیا۔ ان کے سوال انتہائی مختصر اور انداز بذراستہ کا تھا۔ وہ صحیح صحیح کر مجھ سے پوچھتے رہے کہ میں کون ہوں، دفنی میں کب سے قیام پذیر ہوں اور میرا ان آئٹمز سے کیا تعلق ہے اور یہ کہ میں کس کے لیے کام کرتا ہوں.....؟ میرے پاس جواب میں سوائے خاموشی کے اور کچھ نہیں تھا اور پھر کوئی چارہ نہ پا کر انہوں نے دھیرے دھیرے اپنے ستم کا دائرہ کار بڑھانا شروع کر دیا۔ میرے بدن کے ہر جوڑے کو لوہے کی ایک چھوٹی سی مخصوص تھوڑی سی اس طرح ٹھوکا گیا کہ ہر ضرب روح میں چھید کرتی محسوس ہو رہی تھی۔ جسم کو جلنے لگتا تھا۔ وہ وقفہ وقفے سے داغ جاتا رہا اور اس تمام عرصے میں مجھے بچوں کے بل کھڑا کر کے میرے ہاتھ اسی کھردری رستی سے چھت پر ایک کٹھن کے ساتھ باندھ رکھے گئے، اس طرح کہ میرے بازوؤں پر میرے جسم کا سارا بوجھ یوں پڑتا رہے کہ میرے شانوں اور کہنیوں کے جوڑے کھل جائیں۔ وہ ہر بار تشدد کے وقفے میں دوبارہ اپنا سوال دہراتے کہ میں کس کے لیے کام کرتا ہوں؟ میں ہر دفعہ تکلیف اور اذیت کے سمندر سے گزرتے ہوئے ذہن پر جب ہوش کی حد پار کر کے بے سندھ ہو جاتا تو مجھے یہی لگتا تھا کہ میری روح قلنسو غصری سے پرواز کر گئی ہے اور اب میں دوبارہ کبھی ہوش میں نہیں آؤں گا۔ مگر میرے ستم گر بہت تجربہ کار اور اپنے فن میں ماہر تھے۔ انہیں مجھے زندہ رکھنا آتا تھا اور پھر ایک وقت ایسا بھی آیا کہ ان میں سے ایک نے تھک کر دوسرے دو چلا دوں سے کہا کہ اسے ڈر ہے کہ کہیں میں مری نہ جاؤں، لہذا ہمیں اسے سلاطین کا گواہ بنالینا چاہیے اور مجھ سے عدالتی اسنادیں بھیج کر ایک معاہدہ کر لیا جائے کہ اگر میں انہیں اپنے گردہ یا مالک میں سے کسی ایک کے بارے میں بھی اقبالی بیان دے دوں، تو وہ مجھے اگلے جہاز سے میرے ملک بتا کسی الحرام کے ڈی پورٹ کر دیں گے۔ مجھے وہاں قید ہونے کے بعد دو یا تین دن کا حساب تو یاد رہا تھا مگر پھر اس کے بعد اذیت کی شدت سے میری بے ہوشی کے وقفے اسے طویل ہونے لگے کہ مجھے دن اور رات کی ہر تیز اور گنتی بھول چکی تھی۔ جانے میرے اندر درد برداشت کرنے کی اتنی سکت کب اور کیسے پیدا ہو گئی تھی۔ شاید ساری عمر زبان کے گھاؤ سبب سے سبب سے، روح کو بھی اذیت پہنچے اس قدر عادت ہو گئی تھی کہ جسم پر ہر لمحہ لگتے یہ گھاؤ اور داغ ان روح کے زخموں کے مقابلے میں مجھے بہت کم تر محسوس ہوتے تھے۔ وہ مجھے ہر طرح سے آزما چکے تو آخری حربے کے طور پر انہوں نے میرے ہاتھ اور پاؤں کے ناخن میری کھال سے نوچنے کے لیے خصوصی طور پر تیار کردہ اوزار منگوا لیے۔ ان میں سے ایک میرے ہاتھ کھولنے نیچے جھکا تو دوسرے نے بے زاری سے ایک لمبی انگڑائی کی کہ آدمی رات تو بیت ہی چکی ہے تو کیوں نا اس ”نیک کام“ کو اگلے روز صبح تک موخر کر دیا جائے۔ ویسے بھی میری حالت اس وقت تک اتنی ابتر ہو چکی تھی کہ شاید مجھے اپنے ماس سے ناخنوں کے ٹکڑے ہونے کا پتا بھی نہ چلتا۔ کتنی عجیب بات ہے کہ درد اور اذیت محسوس کرنے کے لیے بھی انسان کا اپنے حواس میں رہنا ضروری ہے۔ مجھے اُس روز دنیا کے ہر دیوانے اور خرد سے بچائے شخص کی تقدیر پر ٹوٹ کر رشک آیا۔ نہ دنیا میں کسی درد کا جھیلنا اور نہ آخرت میں کسی عذاب کا ڈر۔ کاش! اس دیوانے پن کو اختیار کرنا بھی ہمارے اپنے بس میں ہوتا۔

وہ لوگ جانے کس وقت تہہ خانے سے جا چکے تھے، مگر میرا ذہن ابھی تک کسی آزاد جنگی اور وحشی گھوڑے کی طرح بے لگام دوڑ رہا تھا۔ دفعتاً مجھے یوں محسوس ہوا کہ میری پشت پر بندھے ہاتھوں کی گرفت کچھ ڈھیلی پڑ رہی ہے، شاید کوئی ایک آدھ گراہ کھل رہی تھی۔ میں نے کرسی کو دو چار زوردار جھٹکے دیئے کی کوشش کی تو منہ سے جھینس نکل گئیں۔ اذیت، درد اور تکلیف سے درد پاؤں کے بند کھل سے گئے اور میرے جسم کے تمام مساموں سے درد یوں قطرہ قطرہ کر کے پھوٹ نکلا، جیسے شدید گرمی کی کڑی دوپہر میں پسینہ پھوٹتا ہے۔ کرسی ایک جانب لڑھک گئی اور میں اس کے ساتھ ہی بندھے ہاتھوں پیروں سمیت زمین پر اونٹھ سے منہ کر گیا۔ کچھ دیر کے لیے تو میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا چھا گیا، جانے کتنی دیر بعد دوبارہ ہوش آیا تو محسوس ہوا کہ کرسی کی پتھری ٹوٹ چکی

ہے اور ہاتھ پشت سے تقریباً کھل چکے ہیں۔ میں نے پوری قوت لگا کر ایک جھٹکے سے اپنے ہاتھ آزاد کروائے اور کا پتی، زخمی، خون سے سنی انگلیوں کے ساتھ اپنے پیروں کی بندشیں بھی کھول ڈالیں۔ خود کو کسی نہ کسی طرح گھمٹتے ہوئے سبز سیڑیوں تک جا پہنچا اور پھر، چاروں ہاتھوں پیروں کی مدد سے جانے کتنی صدیوں میں سبز حیاں چڑھ کر اور تہہ خانے کے دروازے تک اپنے گھائل اور پور پور زخمی بدن کو پہنچایا۔ خوش قسمتی سے دروازہ ایک ہلکی سی کڑی کی مدد سے باہر کی جانب سے بندھا اور جب میں نے اپنے پورے جسم کے وزن کو دروازے پر دو چار مرتبہ دے مارا تو چھٹی کھل گئی اور میں اپنے ہی زور پر، باہر کھلے ہال میں جا گرا۔ میری توقع کے برعکس وہ کوئی جیل یا دفتر کے بجائے ایک دیرانہ سی مکمل عمارت تھی، جس کے تہہ خانے میں مجھے قید کر دیا گیا تھا۔ میں پوری قوت لگا کر لڑکھڑاتا ہوا کھڑا ہو گیا اور اس کوشش میں جانے کتنی بار زمین پر گرا۔ میرے قدم یوں جھولتے ہوئے زمین پر پڑ رہے تھے، جیسے ناگوں میں موجود ہر ہڈی کو بھیس کر چکنا پھڑ کر دیا گیا ہو۔ کسی نہ کسی طرح میں زیرِ قہر ہال کے ڈھانچے سے باہر نکلا اور دُور مگن میں نظر آنے والے لوہے کے بڑے گیٹ کی طرف بڑھا۔ میں احاطے کی دیوار کا سہارا لے کر دھیرے دھیرے گیٹ کے قریب پہنچا ہی تھا کہ اچانک گھن اور عمارت کا پورا احاطہ تیز روشنی سے جگمگا اٹھا۔ صرف اندھیرا ہی انسان کی بصارت نہیں چھیٹتا، کبھی روشنی کی چکا چوند بھی اندھا کر دیتی ہے۔ میں بھی چند لمحوں کے لیے ٹاپنا سا ہو گیا اور پھر مجھے بہت سے سامنے اپنی جانب دوڑتے نظر آئے، میں نے دیوانہ وار گیٹ سے باہر نکلنے کے لیے چھلانگ لگائی، مگر مجھے راستے ہی میں کسی نے دبوچ لیا اور میں اس طرح بے سندھ ساز مین پر گر گیا، جیسے سیکڑوں میل صحرا اور جنگل میں لگا تار دوڑنے والا کوئی گھوڑا شدید تھکن سے پھر رہا ہو کہ ہاتھ پائے آخری باز کبھی نا اٹھنے کے لیے زمین پر گر جاتا ہے۔ میری ہلکیس بھول ہو کر دھیرے دھیرے بندھوتی گئیں۔ شاید میری موت آخر کار مجھے اپنی مہربان آغوش میں لینے کے لیے، ہلکوں کے در پر اپنے سفید کچھ پھیلائے آکھڑی ہوئی تھی۔ مجھے اس موت کی دیوی کی آواز بھی سنائی دے رہی تھی۔ ”نہی زار..... اٹھو..... چلو بہت دیر ہو گئی.....“ میں نے غور سے آواز سننے کی کوشش کی۔ ہاں، کوئی میرا نام پکار رہا تھا، مگر یہ آواز.....؟ ہاں، میں اس آواز کو پہچانتا تھا۔ کوئی کسی سے کہہ رہا تھا ”اسے اب ہوش میں لاؤ..... یہ مجھے زندہ چاہیے.....“ میرے ڈوبتے ذہن نے آواز پہچان لی..... یہ بہرہ زور کریم کی آواز تھی۔ تو کیا مجھے بہرہ زور کریم نے خود انخوا کر دیا تھا؟

(جاری ہے)



باشم ندیم نوجوان نسل کے پسندیدہ، ملک کے معروف و منفرد اماراتسز، ناول نگار ہیں۔ ان کے ناول ”خدا اور محبت“ اور ”بچپن کا دبستا“ نے بین الاقوامی پذیرائی حاصل کی، تو جنگ، سنڈے میگزین میں شائع ہونے والے ناول ”عبداللہ“ کو بھی وقت کے پسندیدہ ترین ناول کا درجہ حاصل ہوا۔ انہیں ان کی ادبی خدمات پر حکومت پاکستان نے تمغہ حسن کارکردگی سے نوازا۔ نیز، قلم کے شعبے میں ”عبداللہ“ نامی ایک بین الاقوامی فلم کے تخلیق کار کی حیثیت سے بھی قدم رکھ چکے ہیں۔

”پری زلف ایک اچھوٹے، حساس اور قدرے مشکل موضوع پر مبنی بہت دل گدازी تحریر ہے، یہ ایک ایسے شخص کی کتا ہے، جسے اک کم صورتی کے عیب کے سبب، اس ظاہر پسند و زر پرست دنیا کے اُن گنت بد صورت رویوں، بدینت آئینوں کا سامنا کرنا پڑا۔ ناول سے متعلق اپنی آراء سے آگاہ کرنا ہرگز محنت بھولے لیے گا۔ ہمارا پتا دہلی پرا نا ہے:

ایڈیٹر "سندھ میگزین" روزنامہ جنگ، شعبہ میگزین، اخبار منزل، آئی آئی چندر گپروڑ، کراچی۔ ای میل:

[sundaymagazine@janggroup.com.pk](mailto:sundaymagazine@janggroup.com.pk)

بہروز کریم کی آواز سنتے ہی میرے خوابیدہ حواس کو ایک جھٹکا سا لگا، مگر پھر میں ہوش کی سفاک سرحدوں کو پار کر گیا۔ میں آج تک یہ نہیں سمجھ پایا تھا کہ یہ سرحدیں کیوں بنائی جاتی ہیں۔ جاوید اختر نے ٹھیک ہی کہا تھا، ”سرحدیں انسانوں کے لیے ہوتی ہیں..... سوچو تم نے اور میں نے، کیا پایا انسان ہو کے؟“ میں بھی ایک ایسا ہی بد نصیب انسان تھا۔ ننھی، نڈیا یا پون کا جھونکا ہوتا تو جانے کب کا اس سفاک دنیا سے پرواز کر چکا ہوتا، مگر میرے پُر تو بندھے ہوئے تھے، جتنی بار ہوش آیا، میں نے خود کو سفید بیٹوں میں بندھے پایا، پھر نہ جانے کتنے دن بعد مجھے تھوڑی دیر کے لیے مکمل ہوش آیا تو میں ایک آرام دہ کمرے میں ایک نرم بستری پر پڑا تھا۔ ایک نرس میرے قریب بیٹھی مستعدی سے میری دواؤں کا چارٹ بنارہی تھی، میں نے گھبرا کر اس سے پوچھا۔

میں کہاں ہوں.....؟“ تو وہ سکرا کے بولی۔ ”فکر مت کرو، تم محفوظ ہاتھوں میں ہو..... تمہارے دھیرے دھیرے بھر رہے ہیں، تم اس آرام کرو۔“

نرس کمرے سے نکل گئی اور پھر جتنی دفعہ بھی مجھے ہوش آیا، میں نے اسی نرس اور چند مخصوص چہروں کو اپنے ارد گرد منڈلاتے دیکھا، جو پوری طرح میرا خیال رکھ رہے تھے۔ یہ زخم بھی کتنے بے وفا ہوتے ہیں۔ سیمائی کا مزمع ملنے ہی کیسے اپنا مسکن، ہمارا یہ جسم چھوڑ جاتے ہیں۔ وہی جسم جو ان زخموں کی خاطر جانے کیسے کیسے درد اور عذاب جھیلتا ہے، یہ آئی کو بھول جاتے ہیں۔ ان سے اچھے تو ان زخموں کے دیے ہوئے داغ ہوتے ہیں۔ غم بھر ساتھ تو نبھاتے ہیں۔ تقریباً ہفت بھر بعد میں اٹھ کر بیٹھنے کے قابل ہو گیا۔ مجھے سب سے زیادہ فکر رفتی کی تھی۔ جانے وہ میری تلاش میں کہاں کہاں بھٹک رہا ہوگا۔ میری دیکھ بھال پر مامور طبی عملہ میرے کسی سوال کا جواب نہیں دیتا تھا یا شاید انہیں واقعی کچھ پتا ہی نہیں تھا اور پھر آٹھویں دن پہلی مرتبہ فیروز خان کا چہرہ نظر آیا۔ وہ میرے کمرے میں داخل ہوا تو میں اٹھ بیٹھا۔ ”یہ سب کیا ہے فیروز..... میں کہاں ہوں، مجھے یہاں کون لایا ہے، مالک کہاں ہیں، کوئی میری بات کا جواب کیوں نہیں دیتا.....؟“ فیروز نے حسب معمول خاموشی سے میرے سارے سوالات سنے اور پھر بہت اطمینان سے بولا۔ ”سب پتا چل جائے گا۔ ویسے تم تو واقعی بہت سخت جان نکلے، ورنہ میرا خیال تھا کہ تم جیسا کچا لڑکا ایک جھٹکے کی میں ٹوٹ جائے گا۔ مگر زندگی میں پہلی مرتبہ میرا اعزاز ملنا ثابت ہوا۔“ میں نے حیرت سے فیروز کی طرف دیکھا۔ ”کیا مطلب، تو کیا تم لوگوں کو خبر تھی کہ مجھ پر کیا گزر رہی ہے، اور مجھے انوکھ کر کے کہاں رکھا گیا؟“ فیروز کا چہرہ پھر بے تاثر تھا۔ اس نے جب سے اپنی مخصوص برائے کی بیڑی لٹائی اور ہونٹوں میں داب کر سکا لی۔ ”ہاں، نہ صرف جگہ کا پتا تھا، بلکہ تمہیں یہاں اٹھا کر لانے والے بھی ہمارے ہی آدمی تھے۔“ میرے دماغ کا تو جیسے فیروز ہی اڑ گیا، میں نے چلا کر کہا۔ ”مگر کیوں، میرے ساتھ یہ سب کچھ کیوں کیا گیا.....؟“

”فیروز کا لہجہ اب بھی دھیمہ اور ہنسکون تھا۔“ تم ہی نے تو مالک سے کہا تھا کہ تمہیں بہت چسپا کا نا ہے۔ یہ چسپا کمانے کی پہلی کسوٹی تھی۔ تم کیا سمجھتے ہو کہ ہم اتنے ہی پاگل ہیں کہ ایک دن راہ چلتے تمہیں ہسپتال تھا کر دوڑوں رپال کا مال لینے ساحل پر بھیج دیں گے، چسپا کمانے کے لیے صرف کلائی کی نہیں، کچیلے کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ تمہاری برداشت، حوصلے اور بہادری کا امتحان تھا۔ ہم میں سے جو بھی مالک کے خاص کارندے ہیں، انہیں اسی طرح کی کئی آزمائشوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ ہاں، مگر تم پر مالک نے کچھ زیادہ ہی سخت ہاتھ رکھا۔“ میں منہ کو لے حیرت سے فیروز کی بات سنتا رہا۔ اس نے مجھے بتایا کہ ساحل پر ہونے والے ڈرامے سے لے کر میرے فرار کی کوشش تک سب ہی پہلے سے طے شدہ تھا۔ مجھے بہروز کریم کے خاص گروہ میں شامل کرنے سے پہلے انہیں میری وفاداری کا ہر طرح سے امتحان لینا تھا۔ فیروز کے مطابق اگر میں کسی بھی مرحلے پر ہار کر اپنی زبان کھول دیتا تو اسی لمحے مجھے اس اذیت خانے سے نکال کر پہلی فلائٹ سے ڈی پورٹ کر دیا جاتا۔ مجھے فرار کا موقع بھی جان بوجھ کر دیا گیا تھا، کیوں کہ بہروز یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ کہیں میں درد سے ٹوٹ کر اپنی ہمت اور حوصلہ تو نہیں کھو بیٹھا۔ فیروز نے مجھے یہ بھی بتایا کہ ایسی ساری کارروائیوں کی براہ راست نگرانی خود بہروز کریم کرتا ہے، کیوں کہ اُسے اپنے ارد گرد صرف ایسے خاص چنے ہوئے وفاداروں کا گروہ چاہیے ہوتا ہے، جو اس کے ہر امتحان پر پورا اترے۔ میں نے فیروز سے رفیق کے بارے میں پوچھا تو اس نے تسلی رکھتے ہوئے کہا کہ رفیق کو اتنا ہی پتا ہے کہ مجھے مالک نے کسی ضروری کام سے ابوالطی کے دفتر بھیج دیا ہے اور اس غرض سے وہ لوگ میری طرف سے رفیق کو میرے گھر بھیجنے کے لیے پیسے بھی دیتے رہے ہیں۔ وہیں بیٹھے بیٹھے فیروز نے اپنے فون پر میری رفیق سے بات بھی کرادی۔ میری آوازیں کر رہی رفیق کھل سا گیا۔ ”اوئے کہاں ہو تم یار! ایسی بھی کیا نوکری، یاروں کو ہی بھلا دیا۔“ میری آواز بھرا سی گئی۔ مگر میں نے صرف اتنا کہا کہ میں جلد ہی واپس آ کر تم سے ملوں گا۔ اور پھر فیروز کے جانے کے بعد میں نے تھک کر آنکھیں موند لیں۔

اس دن مجھے احساس ہوا کہ دنیا میں انسان دولت، روپیہ، پیسہ، سب کچھ کما لیتا ہے، مگر سب سے مشکل کسی کی وفاداری کمانا ہے کہ اس کا تعلق کسی دوسرے کے غلوں اور ایمان سے ہوتا ہے۔ بہرہ ور کریم کی یہ احتیاط اور پریشانی اپنی جگہ بجا تھی۔ سلطنت بنالینے سے کہیں زیادہ مشکل سلطنت کو قائم رکھنا ہوتا ہے۔ دنیا کے بڑے بڑے شہنشاہ بہت چھوٹے اور معمولی خداریوں کے ہاتھوں اپنی بادشاہت گنوا چکے ہیں اور بہرہ ور کریم مجھے تاریخ یاد رکھنے والا شخص معلوم ہوتا تھا۔ شام کو اچانک باہر وہی ٹیبل سی جی گئی، جو بہرہ ور کی آمد کا خاتمہ اور ابتدائی پیغام لے کر آتی تھی۔ کچھ ہی دیر بعد بہرہ ور میرے کمرے میں موجود تھا، فیروز خان بھی اس کے ساتھ آتا تھا۔ میں نے کھڑے ہونے کی کوشش کی تو بہرہ ور نے مجھے بیٹھ کر بنے کا اشارہ کیا اور خود مہتر کے سامنے بڑی کرسی پر بیٹھ

کر مجھے بہت دیر تک غور سے دیکھتا رہا۔" کچھ کہو گے نہیں مجھ سے، میری وجہ سے تم پر ظلم کے اتنے پہاڑ توڑے گئے تمہاری نفس میں درد کا زہر بھر دیا گیا۔ غصہ تو بہت آیا ہو گا مجھ پر۔" میں نے زندگی میں پہلی مرتبہ برا دراست بہروز کی طرف دیکھا۔ "نہیں..... آپ نے وہی کیا، جو دنیا میں کسی کی بھی وفاداری جانچنے کے لیے رائج طریقہ ہے۔ انسان کا جسم ہی بظاہر اس کی سب سے بڑی کم زوری اور مجبوری ہوتا ہے۔ تو اگر آپ نے بھی کم زوری کو ذرا کر وفاداری کی جانچ کی تو کیسا گھٹکھوکھو.....؟" بہروز نے دل چسپی سے پوچھا۔ "خوب! گویا وفاداری پر کھنے کا کوئی اور طریقہ بھی ہوتا ہے، میں بھی جانتا چاہوں گا۔" جس وفادار کے لیے اس کا جسم اور دردم زوری ہو، اس کے لیے برداشت کی جانچ ہی سب سے آزمودہ طریقہ ہے، مگر جسے درستہ اور اذیت برداشت کرنے کی عادت پڑ چکی ہے، اس کا امتحان کیا ہوگا؟" بہروز پچ رہا۔ میں نے اپنی بات جاری رکھی۔ "اس دنیا میں ہر انسان کے لیے قدرت نے ایک الگ امتحان تیار کر رکھا ہے۔ کہیں درد، کہیں دولت، کہیں شمس اور کہیں اقتدار، آپ نے تو ابھی مجھے صرف ایک آزمائش سے گزرا رہے، اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ میرے حصے کا امتحان ہی نہ ہو.....؟" بہروز نے اپنے سگار کو بے خیالی میں توڑا اور فیروز خان نے جلدی سے لائٹر سے سگار کو شعلہ دکھایا۔ "تم ٹھیک کہہ رہے ہو لڑکے، مگر میں اپنے وفاداروں کو اتنا کچھ دے دیتا ہوں کہ انہیں اور کسی چیز کی حسرت ہی نہیں رہتی، لیکن ایک بات تمہاری دل کو گنتی ہے۔ واقعی وفاداروں کی وفات اپنے کا کوئی حتمی پیمانہ ایجاد ہی نہیں ہوا کبھی۔ انسان کے خون ہی میں وفات نہ ہوتی صرف دل بھلاوے کی آزمائشیں ہیں۔ مجھے تمہاری صاف گوئی پسند آئی اور مجھے تمہاری عتوبہ برداشت کی بھی داد دینی پڑے گی، حالانکہ وہ دیکھنے میں تم اتنے سخت جان نہیں لگتے۔ بہر حال، اب تم بھی ہماری ٹیم کا حصہ بن چکے ہو مگر یاد رہے، جس دنیا میں تم قدم رکھتے جا رہے ہو، وہاں سے واپسی کا کوئی دروازہ نہیں۔ میں کبھی خود کسی کو یہ پیش کش نہیں کرتا مگر تم اگر چاہو تو میں آج بھی تمہیں بہت کچھ دے کر واپس تمہارے ملک رخصت کر سکتا ہوں۔ مگر ایک بار جب تم ہمارے راز اور ٹھکانوں سے واقف ہو گئے، تو پھر تمہاری واپسی کبھی ممکن نہیں ہوگی۔ چاہو تو میں تمہیں سوچنے کے لیے دو دن مزید دے سکتا ہوں۔" "میں واپس جانے کے لیے یہاں نہیں آیا تھا۔ یہاں آنے سے پہلے ہی میں اپنے واپسی کے سارے راستے بند کر چکا ہوں، اور واپسی کی فکر وہ کرتے ہیں، جن کی واپسی کا کوئی منظر ہو۔ میرا کوئی آگے سے نہ پیچھے۔ آپ حکم کریں، مجھے کیا کرنا ہوگا؟" بہروز نے اطمینان سے میری بات سنی اور پھر کاغذ کا تھپتھپاتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔ "پہلے تم مکمل صحت یاب ہو جاؤ، پھر بہت کام پڑے ہیں تمہارے کرنے کے۔ اور ہاں، کچھ دن بعد تمہارے دوست کو یہاں سے کسی بہتر جگہ ٹرانسفر کر دیا جائے گا، کیوں کہ یہاں سے واپسی کے بعد تم اس کے ساتھ نہیں رہو گے۔" بہروز کریم کمرے سے باہر نکل گیا۔

فیروز خان کچھ حیرت زدہ سا تھا، وہ ایک لمحے کے لیے میرے پاس رکا۔ "تم واقعی بہت خوش قسمت ہو لڑکے! لاکھوں میں نے آج تک اتنی باتیں کسی سے کرتے نہیں دیکھا۔ جلدی تندہ رست ہو کر باہر آنا تمہارے ساتھ مل کر کام کرنے میں مزہ آئے گا۔" فیروز چلا گیا اور اس کے ٹھیک ایک ہفتے بعد جب میں رفیق کے فلیٹ پہنچا تو وہ اپنا سامان باندھ رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر مجھ سے لپٹ گیا۔ "اچھا ہوا تم آ گئے، مجھے مالک نے انچارج بنا کر انٹیلی والی فیکٹری میں ٹرانسفر کر دیا ہے۔ پر تم فکر نہ کرنا، میں نے مالک سے التجا کی ہے کہ وہ تمہیں بھی جلدی ترقی دے کر میرے پاس بھجوا دے۔ جب تک تم ٹیم میں میرے فلیٹ میں رہو گے۔" میں خاموش رہا۔ اب میں اسے کیا بتاتا کہ ہمارے راستے جدا ہو چکے ہیں۔ میں رفیق کو رخصت کرنے اور پورٹ تک اس کے ساتھ آیا اور جہاز فضا میں بلند ہونے تک باہر لاؤنچ میں کھڑا رہا۔ ہماری زندگی میں کچھ ایسے لوگ بھی آتے ہیں، جن کی موجودگی کے کین زیادہ ہمیں ان کی غیر حاضری محسوس ہوتی ہے۔ رفیق کے جانے کے بعد میں نے اسے زیادہ قریب پایا۔ ہم انسان اتنے کوتاہ نظر کیوں ہوتے ہیں؟ اپنے قریب کی چیزیں، رشتے، شائے اور لوگ ہمیں کیوں نظر نہیں آتے، جب کہ ان ہی جذبوں اور رشتوں کی تلاش میں ہم سات سمندر پار تک ساری دنیا چھان لیتے ہیں، مجھے تو ویسے بھی دو چار دن میں بہروز کریم کی طرف سے دیے گئے نئے اپارٹمنٹ میں شفٹ ہو جانا تھا، مگر رفیق کے جانے کے بعد مجھ سے چوبیس گھنٹے بھی اُس فلیٹ میں نہیں رہا گیا۔ میں نے فیروز کو کھلا بھیجا کہ ہو سکے تو مجھے چند دن کے لیے کسی ہوٹل میں منتقل کروادے۔ جواب میں فیروز نے شام تک ایک بڑے فرشتہ اپارٹمنٹ کی چابی میرے حوالے کر دی۔ جہاز سازی کے اس اپارٹمنٹ میں ضرورت کی ہر شے پہلے سے موجود تھی۔ ہر چیز نئی، قیمتی اور چمکتی ہوئی۔ قرینے سے سجائی گئی۔ اتنی بڑی خواب گاہ، جس کی کھڑکی سمندر کی طرف کھلتی تھی۔ دیزیرانی قالین، روشنی پردے، فانوس، بڑے بڑے مصوروں کی تصویریں سے سجی دیواریں، ساتویں منزل پر رہنے والے اس اپارٹمنٹ کا سمندر کی طرف کھلنے والا ٹیرس اور وہاں پڑی وہ بید کی قیمتی آرام کرسی..... پل بھر کے لیے مجھے اپنے گھر کی چھت پر بناوہ گودام نما چھوٹا سا کمرایا دیا گیا اور میری آنکھیں بھیگ گئیں۔ اس چھوٹے سے ڈرپے نما کمرے سے لے کر اس عالی شان اپارٹمنٹ کے سفر میں نہ جانے میں نے پایا زیادہ تھا یا کھو بہت۔ مجھے ابھی تک یہ نہیں بتایا گیا تھا کہ مجھے کام کیا کرنا ہوگا۔ مگر ایک بات تو بہت حد تک واضح ہو چکی تھی کہ بہروز کریم کے کچھ ایسے خفیہ دھندے بھی ہیں، جو قانون کی نظر سے ٹھپ کر جاری تھے۔ فیروز سے مجھے اتنا ضرور پتا چل گیا تھا کہ وہ لوگ در پردہ سونے کی اسٹاکنگ کا کاروبار کرتے تھے، یہ دولت کماتا بھی تو ایک خطہ ہے۔ شاید دنیا کا سب سے بڑا خطہ اور جنوں، اور نہ بہروز کریم کو بھلا مزید وہ پتا کمانے کی کیا ضرورت تھی۔ یا شاید یہ بھی ایک نثر ہے۔ کچھ لوگ خراج کر کے اس منے کا سرور محسوس کرتے ہیں اور کچھ جمع کر کے۔ اسی روز مجھے ایک اور اور کام بھی ہوا کہ دولت مند کی دولت چھٹی بڑھتی جاتی ہے، وہ اتنا ہی اپنے اندر سے خود کو غیر محفوظ تصور کرنے لگتا ہے اور ٹھیک اس کے برعکس فقیر کا فقر اور فاقہ بھٹاتا زیادہ بڑھتا ہے، وہ اتنا ہی بہادر اور لا پرواہ ہوتا جاتا ہے۔ میں بھی جب تک فقیر تھا، مجھے اپنی جھانگ چار پائی پر بھی جھوٹے جھوٹے نیند آ جاتی تھی اور آج جب میرے پاس دعویٰ کے سب سے پوش علاقے میں جبکہ ترین اپارٹمنٹ موجود تھا تو میں اپنی خواب گاہ کی نرم مسمری پر ساری رات بے چینی سے کروٹیں بدلتا رہا۔

اگلی صبح سویرے ہی فیروز خان کا پیغام آ گیا کہ بہروز کچھ دن کے لیے شہر سے باہر جا رہا ہے۔ اور جانے سے پہلے اس نے ہم سب کو کسی خاص میٹنگ



کے لیے اپنے ساحل والے جنگل پر بلا پایا ہے۔ سہ پہر کو ڈرامیو گارڈز لے آیا اور مجھے اور دو چار مزید ارکان کو لیے وہ بہرہ ور کریم کی شاہانہ رہائش گاہ پہنچ گیا۔ میں نے اس سے پہلے ہی جگہ نہیں دیکھی تھی۔ میرا اندازہ درست تھا۔ بہرہ ور کو صرف کمانڈیشن، خرچ کرنا بھی آتا تھا اور اس نے اپنی اس رہائش گاہ پر بھی بھر کے خرچ کیا تھا۔ کہتے ہیں انسان کا خط اور اس کی رہائش کا سلیقہ، اس کے اندر کے آدمی کی نزاکت یا کڑھائی ظاہر کرتے ہیں۔ بہرہ ور کریم کا یہ عالی شان محل اس مثال کی غمازی کر رہا تھا۔ اندر داخل ہوتے ہی ایک جانب پورچ میں دنیا کی چند بہترین اور مہنگی ترین گاڑیاں شیلڈ کے نیچے کھڑی تھیں۔ شاید بہرہ ور کو دنیا کی نایاب ترین کاریں جمع کرنے کا شوق تھا۔ دائیں جانب چھوٹی سی پانی کی ایک نہر تھی، جس سے پرے، بہتر سے پر ایک وسیع و عریض گالف کورس بنایا گیا تھا۔ گھاس کے اونچے نیچے ٹیلوں کی پشت پر جہاں وہ پتھر اور درختوں کے ٹھنڈے ختم ہوتے تھے، وہاں ٹینس کورٹ بھی تھا، مگر گاڑی ہم سب کو لیے ان سب ٹیوبوں کو پار کرتی شیشے اور لکڑی کی ایک خوب صورت عمارت کی طرف بڑھتی گئی، جو شاید بہرہ ور کے جنگل کی انہیسی تھی، کیوں کہ اصل گھر جو کسی برطانوی دور کے قلعے سے مشابہ تھا، اس کی سرخ اور بھوری اینٹوں سے بنی عمارت تو ان سب سے پرے دکھائی دے رہی تھی۔ ہم سب انہیسی میں داخل ہوئے تو بہرہ ور اور فیروز خان پہلے سے وہاں موجود تھے۔ بہرہ ور نے مجھ سمیت سب کا حال پوچھا اور پھر میں بتایا کہ اسے اچانک ایک ضروری کام سے چند دن کے لیے لندن جانا پڑ رہا ہے۔ اور اس کی واپسی جتنے پھر میں متوقع ہے۔ پھر اس نے فیروز کو اس عرصے میں کبھی ارکان کی ڈیوٹی کے بارے میں تفصیل بتانے کی ہدایت کی، فیروز نے سب کو مختلف ادھورے کام اور وہودے بتائے، جو اس عرصے میں انہیں پایہ تکمیل تک پہنچانے تھے۔ مگر میرے لیے اس تفصیل میں کوئی فرض شامل نہیں تھا۔ باقی سب رکن ایک ایک کر کے وہاں سے رخصت ہوتے گئے اور پھر آخر میں صرف ہی بی بی کھڑا رہ گیا۔ بہرہ ور کریم نے مسکرا کر فیروز سے پوچھا ”کیوں فیروز خان اپنی زاد سے تمہاری بہت دوستی ہو گئی ہے کیا، اسے کوئی کام نہیں دیا تم نے؟“ فیروز خان نے حسب معمول سپاٹ چہرے کے ساتھ جواب دیا ”یہ ابھی نیا ہے مالک..... اور اسے کوئی پرانا سودا بھی نہیں چکا تا۔ آپ خود ہی اس کے لیے کوئی کام بتادیں۔“ بہرہ ور نے اپنا مخصوص رگڑ نکالا اور فیروز نے لائٹر سے اسے ساگایا۔ ”ہاں اس کے لیے میرے پاس ایک خاص کام ہے، تم جانتے ہو پوری زاد، تم میرے گروپ کے سب سے نئے رکن ہو۔ اس لیے میرے کاروباری حریفوں اور میرے دشمنوں کی اب تک تم پر نظر بھی نہیں پڑی ہے۔ تمہاری اسی خصوصیت کو میں اس ایک ہفتے میں بروئے کار لانا چاہتا ہوں۔“ میں نے سر جھکا کر کہا ”میں آپ کے حکم کا منتظر ہوں۔“ بہرہ ور نے مجھے بتایا کہ اس نے یہ عمل اپنی چوتھی بیوی کے لیے قبیر کروایا ہے، جو اس کی سب سے زیادہ لاڈلی بھی ہے۔ اس کی باقی دو بیگمات سبیں دہلی میں اور ایک بیوی اور چھوٹا بیٹا لندن میں رہتے تھے۔ وہ لندن اپنے اسی بیٹے کا کسی نام دو تعلیمی ادارے میں داخلہ کروانے کی غرض سے جا رہا تھا، لیکن اسے اپنی اپنی خیم بن دہلی کی بہت زیادہ گڑھ لگی رہتی تھی۔ اسی لیے بہرہ ور نے اس محل میں اس کی تفریح کا ہر سامان مہیا کر رکھا تھا۔ اس کے دشمنوں کو ابھی بہرہ ور کریم کی اس نئی شادی کا علم نہیں تھا۔ نہ ہی وہ کریم کی نئی نوٹی دہلی کی صورت سے واقف تھے۔ مگر بہرہ ور کے بقول اس کی گھروالی اب گھر میں بیٹھے بیٹھے اب بکلی تھی، لہذا وہ اپنی سہیلیوں اور خاندان سے ملنے کے لیے باہر جانے کی ضد کرنے لگی تھی۔ بہرہ ور اس کی محبت کے ہاتھوں انتہائی مجبور ہونے کے باوجود اسے اپنے کسی پرانے وفادار یا محافظ کے ساتھ باہر نہیں بھیجنا چاہتا تھا۔ کیوں کہ بہرہ ور کے پرانے وفاداروں کو پورا شہر جانتا تھا کہ ان کے ساتھ کا مطلب ہی بہرہ ور کے خاندان کی نشان دہی تھا۔ لہذا بہرہ ور چاہتا تھا کہ اس کی غیر موجودگی میں اگر اس کی دہلی کو کہیں جانا ہو تو میں بھی ڈرامیو کے ساتھ اس کے ساتھ جاؤں، دوسری احتیاط مجھے یہ بھی کرنی تھی کہ بہرہ ور کی دہلی کو کسی گارڈ کی موجودگی کی الجھن سے بے بھی بے خبر رکھوں کہ اسے اس زیر زمین دنیا کے خطرات سے آگاہ کر کے بہرہ ور اس کی زندگی اجیرن نہیں کرنا چاہتا تھا۔ ہاں، البتہ جس گاڑی میں، میں ڈرامیو اور بہرہ ور کی وہ لاڈلی گھر سے نکلیں گے، اس کے تعاقب میں بہرہ ور کے خاص وفادار محافظوں کی ایک ٹیم غیر محسوس طور پر سرور رہے گی۔ اس دوسری گاڑی کا صرف مجھے پتا ہوگا اور ان کا ٹھکانہ وہ فون پر میرا رابطہ ہے گا تا کہ جب کبھی میں کوئی خطرہ محسوس کروں تو وہ جھپٹے ہی گاڑی کو اپنی حفاظت کے حصار میں لے لیں۔ پوری بات کہنے کے بعد بہرہ ور نے تصدیق کے لیے میری طرف دیکھا ”سب سمجھ گئے ناں، کوئی بات پوچھنی ہو تو پوچھ سکتے ہو۔ مگر یاد رکھنا، لیٹی صابری جان ہے۔ اسے ہلکی سی کھردھ بھی آئی تو اچھا نہیں ہوگا۔ تمہارے پاس غلطی کی کوئی گنجائش نہیں ہے پوری زاد۔“ میں نے سر ہلایا ”ضمیمہ مالک! میں اچھی طرح سمجھ گیا ہوں۔ کوئی غلطی نہیں ہوگی۔“ بہرہ ور مسکرایا ”شاہاش اتم ظاہر نہیں کرتے، مگر کافی ذہین ہو۔“ میں پپ رہا مگر نہ جانے کیوں مجھے اس ساری کہانی میں کوئی ایک چیز بار بار الجھا رہی تھی، جیسے بہرہ ور نے سب کچھ بتاتے ہوئے بھی کچھ بہت خاص مٹھ پالیا ہو، جیسے کوئی بہت بڑا ڈرامیو ہے اس پاس بھٹک کر میرے کان میں کوئی سرگوشی کر کے کچھ بتانے کی کوشش کر رہا ہو، پھر بتانا پار ہوا۔

کچھ دیر میں ایک ملازم نے آکر بتایا کہ لیٹی صابا جاگ چکی ہیں اور کریم کا پوچھ رہی ہیں۔ بہرہ ور کریم نے اٹھتے ہوئے مجھے بھی اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔ ”تم بھی وہیں آ جاؤ، میں تمہارا تعارف بھی لیٹی سے کروا دیتا ہوں۔“ میں بہرہ ور کریم اور فیروز کے نقش قدم پر چلا ہوا اس محل کے بال نمنا لوناؤںج میں داخل ہوا تو ایک جانب رکھے نفیس اور خوب صورت سفید رنگ کے پیا نو کوڈ کچے کریم کے قدم ٹھٹھک سے گئے۔ مجھے یاد آیا کہ بچپن میں، میں بھی تو ایک پیانسٹ بننا چاہتا تھا اور آج قدرت نے پیا نو کوڈ کھایا بھی تو کہاں..... اسے میں اوپر کی منزل کی طرف سے نیچے آتی لکڑی کی میز چھوں پر کسی کے نازک قدموں کی آواز گونجی، میری نظر اس خود یہ خود جھک گئیں، آنے والی نزاکت سے پاؤں دھرتے نیچے آتے ہی تو بہرہ ور نے مجھ سے کہا ”ان سے ملو پوری زاد، یہ ہیں میری بیگم۔ اس گھر کی مالکن، لیٹی صابا۔“ میں نے جھپٹتے ہوئے نظر اٹھائی اور مجھ پر جیسے ایک ہل کے لیے بکلی ہی گئی۔



.....بہاشم ندیم.....

بہاشم ندیم نو جوان نسل کے پسندیدہ، فنکار کے معروف و منفرد ڈراما رائٹر، ناول نگار ہیں۔ ان کے ناول ”خدا اور محبت“ اور ”بچپن کا دبیز“ نے بین الاقوامی پذیرائی حاصل کی، تو جنگ، سنڈے میگزین میں شائع ہونے والے ناول ”عبداللہ“ کو بھی دقت کے پسندیدہ ترین ناول کا درجہ حاصل ہوا۔ انہیں ان کی ادبی خدمات پر حکومت پاکستان نے تمغہ حسن کارکردگی سے نوازا۔ نیز، فلم کے شعبے میں ”عبداللہ“ نامی ایک بین الاقوامی فلم کے تخلیق کار کی حیثیت سے بھی قدم رکھ چکے ہیں۔

”پری زاد“ ایک اچھوتے، حساس اور قد رے شکل موضوع پر مبنی بہت دل گداز ٹھہری ہے، یہ ایک ایسے شخص کی کہانی ہے، جسے اک کم صورتی کے عیب کے سبب، اس ظاہر پسند، زور پرست دنیا کے آن گشت بد صورت رویوں، بد حیثیت آنکھوں کا سامنا کرنا پڑا۔ ناول سے متعلق اپنی آراء سے آگاہ کرنا ہرگز مت بھولے گا۔ ہمارا پتا وی پرائس:

ایڈیٹر ”سنڈے میگزین“ روزنامہ جنگ، شعبہ میگزین، اخبار منزل، آئی آئی چندر گھر روڈ، کراچی۔ ای میل:

[sundaymagazine@janggroup.com.pk](mailto:sundaymagazine@janggroup.com.pk)

میں نے لیلیٰ صبا کو دیکھا تو چند لمحوں کے لیے تو جیسے پتھر کا ہو گیا۔ بہروز کریم کو خدا نے صرف روپے پیسے ہی سے نہیں نوازا تھا، لیلیٰ صبا کی صورت حسن کی ایک انمول نعمت بھی عطا کر چکی تھی۔ لیلیٰ حسن و زکات کا ایک مکمل استخراج تھی۔ مغربی لباس میں ملیوں، سیاہ فلپرز کے اوپر میروں شرٹ اور گھٹے میں سیاہ اسکارف، گھٹے بال اور بڑی بڑی سیاہ آنکھوں میں نیند کا خمار..... بہروز کریم کی فکر اپنی جگہ بالکل بجا تھی۔ اس گل رخ کی حفاظت کے لیے سارے دینی کو بھی مامور دیا جاتا تو کم تھا۔ کریم نے لیلیٰ سے سیرا تعارف کروایا ”اس سے ملو، یہ پڑی زاد ہے، میرا بیٹا اسٹنٹ.....“ میں نے چونک کر بہروز کی طرف دیکھا، وہ لیلیٰ سے اردو میں بات کر رہا تھا۔ لیلیٰ نے نخوت سے میری طرف دیکھا اور انگریزی میں بہروز سے کہا ”او کم آن آغا، آپ کی پسند کو کیا ہوتا جا رہا ہے؟“ بہروز نے مسکرا کر میری طرف دیکھا اور انگریزی ہی میں مجھے لاؤنچ کے ساتھ ملحق دوسرے کمرے میں انتظار کرنے کو کہا۔ شاید وہ لیلیٰ کو یہ بتانا چاہ رہا تھا کہ میں انگریزی جانتا ہوں۔ میں چپ وہاں سے نکل آیا، مگر لیلیٰ اور کریم کی اونچی آواز میں بحث میرے کانوں تک پہنچتی رہی۔ خاص طور پر جب کریم نے لیلیٰ کو یہ بتایا کہ اب میں گھر سے باہر نکلنے وقت ہمیشہ لیلیٰ کے ساتھ رہوں گا، تو لیلیٰ کی آواز مزید اونچی ہو گئی ”یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں آغا، اب یہ شخص میرا سایہ بنا رہے گا.....؟“ آپ یہ تو سوچیں کہ جب یہ میرے ساتھ چلے گا تو میرا کتنا مذاق بے گار ہوگا، اس سے تو بہتر ہے کہ میں گھر سے باہر نہ نکلوں۔“ بہروز کریم نے اپنے مخصوص خشک لہجے میں بولی کو سمجھایا کہ میرا اس کے ساتھ جا رہا جاؤ کیوں ناگزیر ہے، اور یہ کہ وہ یہ سب کچھ لیلیٰ کی محبت میں کر رہا ہے، ورنہ وہ پردیس جا کر بھی لیلیٰ کی طرف سے پریشانی میں مبتلا رہے گا۔ بہر حال، ایک لمبی بحث و تکرار کے بعد آخر کار وہ لیلیٰ کو معطلے کی نزاکت سمجھانے میں کامیاب ہو گیا۔ اس دن مجھے احساس ہوا کہ محبت کا رنگ کتنا طاقت ور ہوتا ہے کہ جو بہروز کریم جیسے فواد کو بھی پھر بھری مٹی میں تبدیل کر سکتا ہے۔ مجھے نیا حکم ملے گا کہ میں اپنا ضروری سامان لے کر انگیسی منتقل ہو جاؤں، تاکہ اگر کبھی لیلیٰ کو اچانک باہر جانا ہو تو اسے میرا انتظار نہ کرنا پڑے۔ مگر میری انجمن بڑھتی ہی جا رہی تھی۔ بد ظاہر یہ سیدھا سادہ نظر آنے والا معاملہ مجھے بہت مزیدار دکھائی دے رہا تھا۔ جانے کیوں مجھے ایسا لگ رہا تھا کہ بات صرف لیلیٰ کی حفاظت سے کہیں بڑھ کر ہے اور پھر میرے اس خدشے کی تھدق بھی جلد ہی ہوگی، جب انٹرویو رپورٹ روانگی سے قبل بہروز نے مجھے بلا کر سختی سے تاکید کی کہ گھر سے باہر مجھے ہر لمحہ لیلیٰ کے ساتھ رہنا ہوگا اور روزانہ کی رپورٹ دینی ہوگی۔

بہروز کے لندن جانے سے پہلے میں انگیسی میں منتقل ہو چکا تھا۔ فیروز نے لیلیٰ کے اردو بولنے کا معنی بھی چل کر دیا کہ دراصل لیلیٰ ترکی سے تعلق رکھتی ہے اور بہروز نے اسے وہیں استنبول کے ایک میلے میں دیکھا اور اس پر دل بار بیٹھا۔ لیلیٰ نے بہروز کی محبت میں اردو سیکھی اور اب وہ ٹوٹی پھوٹی اردو بول بھی لیتی ہے۔ یہ ان کی شادی کا دوسرا سال تھا، مگر میں بد قسمتی سے پہلے روز ہی لیلیٰ صبا کی نظروں میں ایک پائندہ شخص قرار پا چکا تھا، کیوں کہ اسے بہروز کے لگائے ہوئے پیرے سے شدید چڑ ہوئی تھی اور اس کی جھنجھلاہٹ کا سارا ازلہ مجھ ہی پر گرنا تھا، لیکن اگر بہروز یہ حکم نہ بھی دیتا، تب بھی لیلیٰ جیسی ماورخ کی جھجھجھ سے نفرت لازمی تھی۔ خاص طور پر اس وقت، جب اس شخص کی ہم سفری کی شرط بھی لازمی قرار دے دی گئی ہو۔ میں انگیسی میں اپنے کمرے میں آرام کر رہی پر بیجا بہت دیر تک سامنے دیوار میں لگے بڑے آئینے کو دیکھتا رہا۔ مجھے آئینے پسند نہیں تھے۔ مگر گھر میں، جہر دیوار پر لگے یہ شیشے ہر بل میرا دستہ کرتے رہتے تھے۔ اور گھری پر کیا مختصر، باہر گلی میں، سڑک پر، گاڑیوں میں، عمارتوں کے اندر ہر طرف میرے یہ دشمن میری تاک میں گھات لگائے بیٹھے رہتے تھے۔ میں کہاں کہاں ان سے بچا پاتا۔ سارے شہر میں جا بجا یہ میرا منہ چڑانے اور مذاق اڑانے کے لیے کھڑے ملتے۔ میں نے سوچ لیا تھا کہ اگر زندگی میں کبھی مجھے اپنا گھر بنانے کا موقع ملا تو اس میں کسی آئینے کی جگہ نہیں ہوگی۔ کوئی گوشہ تو اس دنیا میں ایسا ہو، جہاں میں ہا کسی خوف اور جھجک صرف اپنے ساتھ رہ سکوں۔

اگلے روز سہ پہر تین بجے کے قریب مجھے گھر کے ملازم نے آکر حکم سنایا کہ بالکن باہر جانا جاتی ہیں اور ڈرائیو باہر پورچ میں میرا انتظار کر رہا ہے۔ میں گاڑی کے قریب پہنچا تو لیلیٰ صبا غصے میں بھری کھڑی تھی ”اتنی دیر کہاں لگا دی تم نے، کیا اب مجھے تمہاری تیاری کا انتظار بھی کرنا پڑے گا؟“ میں نے اسے بتایا کہ مجھے ملازم نے صرف تین منٹ پہلے روانگی کا بتایا ہے اور میں جس حالت میں بیٹھا تھا، ویسے ہی چلا آیا ہوں۔ مگر لیلیٰ نے میری بات پوری ہی نہیں ہونے دی اور جھڑک دیا۔ ”اچھا اچھا..... ٹھیک ہے، اب گاڑی میں بیٹھو، نہیں کسی فضول بحث کے موذی میں نہیں ہوں“ میں چپ چاپ ڈرائیو کے ساتھ آگے بیٹھ گیا اور لیلیٰ نے عربی میں ڈرائیو سے کہیں چلے کو کہا۔ گاڑی دینی کی بارونی سڑکوں سے ہوتی ایک جدید طرز کی کالونی میں داخل ہو گئی، جہاں اونچے اونچے پختیش پارٹمنٹس کی بہت سی قطاریں تھیں۔ ہماری گاڑی ”بے“ سیریز کے پارٹمنٹس کی قطار کے سامنے آکر رک گئی۔ لیلیٰ نیچے اتری تو میں بھی نیچے اترا آیا۔ اس نے غصے سے میری طرف دیکھا۔ ”تم کہاں آتے آئے..... میں نیچے میرا انتظار کرو، میں اپنی کیمپلی سے مل کر آتی ہوں“ میں نے سر جھکا کر جواب دیا ”مجھے آپ کو کیلانا چھوڑنے کا حکم ہے۔ میں آپ کی کیمپلی کے پارٹمنٹ تک ساتھ چلوں گا۔“ لیلیٰ میری بات سنتے ہی آپ سے باہر



ہوگئی۔ ”باؤ، ڈیرے..... تمہاری بہت کیسے ہوئی مجھے پلٹ کر جواب دینے کی۔ اپنی اوقات میں رہو درن.....“ اس بار مجھے اپنا لہجہ سخت کرنا پڑا۔ ”معافی چاہتا ہوں مگر یہ مالک کا حکم ہے“ ہمارے تعاقب میں آنے والے گاؤں کی گاڑی کچھ فاصلے پر کھڑی ہو چکی تھی، اور مجھے ان کی بے چینی سے ایسا محسوس ہو رہا تھا، جیسے انہیں ہمارا یہاں زیادہ دیر رکنا کچھ پریشان کر رہا ہے۔ لیلیٰ غصے سے دانت جھتی، پھر سختی اندر لٹھ کی جانب بڑھ گئی۔ چند عرصوں میں منزل پر پہنچنے کی دوست کا اپارٹمنٹ تھا۔ اس نے اپارٹمنٹ کا دروازہ کھولا تو دونوں سہیلیاں یوں ملیں، جیسے برسوں بعد ملاقات ہوئی ہو۔ لیلیٰ اندر چلی گئی اور میں باہر راہ داری میں ایک جانب دیوار کے ساتھ لگے لوہے کے بیچ پر بیٹھ گیا۔ تقریباً دو گھنٹے بعد وہ دونوں باہر نکلیں۔ لیلیٰ نے قریبی شہر کی مارکیٹ سے کچھ خریداری کی اور ہم اس کی تکمیل کو اپارٹمنٹ کے باہر چھوڑ کر واپس گھر چلے آئے۔ لیلیٰ نے گاڑی سے اترتے ہی بیچ کر فیروز خان کو حاضر ہونے کا حکم دیا اور غصے میں بھری اندر چلی گئی۔ میں انگلی میں آکر بستر پر دراز ہو گیا۔ تھوڑی دیر بعد فیروز خان بھی وہاں نازل ہو گیا ”تمہاری، مالکن سے کوئی بحث ہوئی تھی؟“ ”ہاں، وہ اسکیلے جانے کی ضد کر رہی تھیں، میں نے صرف مالک کے حکم کی تعمیل کی۔“ فیروز نے ایک لمبی سانس بھری، آئندہ ایسی نوبت نہ آئے تو بہتر ہے۔ لیلیٰ مالکن، مالک کی بہت چڑھتی ہیں۔ وہ یہ سب برداشت نہیں کریں گے۔ یوں سمجھ لو کہ تم ایک دودھاری تلوار پر چل رہے ہو اور تمہیں دونوں جانب ہی اپنا وزن برابر رکھنا ہے، ورنہ نکت کر دو حصوں میں تقسیم ہو جاؤ گے۔“ فیروز جاتے جاتے مجھے ایک نئی انکھ میں جھٹکا کر گیا تھا۔ اگر میں بہرہ ور کریم کا حکم ماننا تو لیلیٰ کی ناراضی یعنی تھی، اور اگر لیلیٰ کی پدایت پر عمل کرتے ہوئے اس سے دور رہتا اور مکمل گھرائی نہ کرتا تو بہرہ ور کی حکم عدویٰ ہوتی اور دونوں صورتوں میں سزا میری مقتدر تھی۔

شام ڈھلتے ہی گھر کے بال سے پیانو کی مدھرتائیں ابھرنے لگیں۔ کوئی پیانو پر بہت خوب صورت ڈھن بجا رہا تھا۔ نہ چاہتے ہوئے بھی میرے قدم بال کی جانب بڑھ گئے۔ ایک بوڑھی، انگریز استانی پیانو بجاتے ہوئے لیلیٰ کو پیانو کا سبق دے رہی تھی۔ میں نے لاؤنچ کی کھڑکی سے بال کے اندر کا منظر دیکھا تو اگلے قدموں واپس چلا آیا۔ گویا لیلیٰ کو بھی پیانو سیکھنے کا شوق تھا۔ چلو، ایک بات تو ثابت ہوئی کہ کم از کم خوب صورت اور بد صورت لوگوں کے اندر ایک سادل ہوتا ہے۔ ورنہ میں تو آج تک یہی سمجھتا رہا کہ بد صورت لوگوں کا دل شاید کچھ کم دھڑکتا ہوگا۔ اگلے روز لیلیٰ صبح سویرے ہی کہیں جانے کے لیے تیار کھڑی تھی۔ شاید ڈرائیور تک، بہرہ ور کریم کی ہدایت پہنچا دی گئی تھیں۔ ورنہ لیلیٰ کا بس چلتا تو وہ اکلی ہی ڈرائیور کے ساتھ نکل چکی ہوتی۔ آج لیلیٰ نے مجھ سے زیادہ بحث نہیں کی اور ڈرائیور سے جمیرا کی طرف چلنے کے لیے کہا اور خواہ مخواہ شام تک ماٹر میں خریداری کرتی رہی۔ جانے یہ امیر عورتوں کو شاپنگ کا اتنا خیال کیوں ہوتا ہے؟ شاید یہ بھی ایک طرح کی بھوک ہوتی ہے۔ اور یہ بھوک صرف بھرے پیٹ ہی لگتی ہے۔ شام کو گھر واپسی کے بعد میرے کان نہ چاہتے ہوئے بھی پیانو کی اس خوب صورت ڈھن کی آس کرنے لگے، ساعت کو بھی تو کبھی کبھی بہت شدید بھوک محسوس ہے۔ خاص طور پر مجھ جیسوں کی ساعت کو کہ جو ساری عمر کی زبان سے دو ٹھٹھے بول سننے کو ترستی رہی۔ اور پھر، ہماری ساعت انسانوں کی زبان سے مایوس ہو کر قدرت کی نکھیری دگر آوازوں میں اپنے حصے کی چاشنی ڈھونڈنے لگتی ہے۔ مجھے بتتے پانی کی آواز، بارش کی خاموش بوندوں کی ٹپ ٹپ، سرسراتی ہوا، جھرنوں اور ایسی مٹھی ڈھنوں کی سرگوشیاں ہمیشہ اپنی جانب کھینچتی تھی۔ سو، جب پیانو کے لے چھڑی تو میں بے اختیار انگلی سے نکل آیا اور باہر باغیچے میں لاؤنچ کی کھڑکیوں کے آس پاس بیٹھنے لگا۔ جانے کتنی دیر بعد اندر سے آواز آتا بند ہوئی اور بوڑھی پیانو نچر سحر پر اسکا رن ٹھیک کرتے ہوئے باہر نکلی اور گیت کی طرف چل پڑی۔ میں نے جلدی سے آگے بڑھ کر اسے سلام کیا اور بہرہ ور کے خادم کی حیثیت سے اپنا تعارف کروایا۔ وہ خوش دلی سے مسکرا دی۔ اس کا نام مارتھا تھا، میں نے مارتھا سے درخواست کی کہ کیا وہ مجھے بھی پیانو بجانا سکھا سکتی ہے، میں اسے پورا معاوضہ دینے پر بھی تیار تھا، مگر مارتھا کے چہرے پر مایوسی کی لکیریں ابھرا آئیں۔ اس نے مجھے بتایا کہ اس کے پاس اپنا پیانو نہیں ہے۔ وہ تو کچھ کن کالونی میں رہتی ہے۔ اور اسکول کے بچوں اور شام کو ایک دو بڑے گھروں میں پیانو سکھا کر اپنا گزارہ کرتی ہے۔ اس کی بات سن کر میری امیدوں پر اوس گر گئی۔ پھر کسی خیال سے میری آنکھیں جھپکیں، ”اگر میں کبھی اپنا پیانو لے سکوں تو کیا آپ مجھے سکھانے آئیں گی؟“ مارتھا میرا سوال سن کر زور سے ہنس پڑی ”ہاں ہاں، کیوں نہیں، بلکہ تمہارا شوق دیکھتے ہوئے میں تمہاری فیس بھی آدمی کر دوں گی۔“ مارتھا ہنستے ہوئے وہاں سے چلی گئی اور میرے دل میں یہ خواب پلٹنے لگا کہ جانے کب میں اپنا پیانو خریدوں گا اور مارتھا سے پہلا سبق لوں گا۔

اب میرے پاس اچھی خاصی رقم ہر ماہ جمع ہو جاتی تھی۔ پیانو خریدنا میرے لیے کوئی خاص بڑا مسئلہ نہیں تھا۔ مگر انگلی میں پیانو رکھنے کی اجازت شاید مجھے نہ مل پاتی۔ ساری رات میں یہی سوچ سوچ کر کروٹیں بدلتا رہا کہ ایسی کیا تدبیر کروں کہ میری برسوں کی دلی خواہش پوری ہو سکے۔ جب خواب روٹھ جاؤں تو راتیں بڑی طویل ہو جاتی ہیں۔ انسان بھی عجب ہے، خواب دیکھے، تو راتوں پر فریب دینے، جال بننے کا الزام لگا دیتا ہے۔ اور خواب نہ آئے تو اسی رات کی طوالت سے اُسے بے زاری ہونے لگتی ہے۔ میں بھی اس طویل رات کے بعد صبح اٹھا تو سر درد سے چھٹ رہا تھا بستر چھوڑنے کو بالکل بھی سن نہیں کر رہا تھا، مگر وہیں بیٹھتی ہی مالکن کا پیغام آ گیا۔ نوکری یا غلامی کی ایک تعریف شاید اپنے اندر کو چکلتا بھی ہے۔ کسی طرح اٹھ کر منہ پر دو چار چھینٹے مارے اور سوئی آنکھوں کے ساتھ پورچ میں پہنچ گیا۔ مگر توقع کے برعکس ابھی تک وہاں کوئی گاڑی رواں لگی کے لیے تیار نہیں تھی۔ البتہ دوسری گاڑی میں محافظ چاقو چوہندا اور تیار بیٹھے تھے۔

کچھ دیر میں اندر سے ایک خادمہ باہر آئی اور اس نے بتایا کہ مالکن اندر لاؤنچ میں مجھے یاد کر رہی ہیں۔ میں الجھا ہوا سالانہ لاؤنچ کی جانب بڑھ گیا۔ جانے اب کیا آفت آنے والی تھی، لیلیٰ کے مزاج کا کچھ بھروسہ نہیں تھا۔ اور یہ بات ابھی تحقیق طلب تھی کہ یہ ظل کثرتِ خُسن کی وجہ سے تھا یا کثرتِ زر کے سبب، کیوں کہ یہ دونوں ہی اپنے اندر مافیٰ ثور پیدا کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ مگر جب میں ہاں میں داخل ہوا تو خلاف معمول لیلیٰ بڑی پُر سکون سی پیانو کے قریب جمی اس کے تاروں سے کھیل رہی تھی۔ مجھے دیکھ کر اس نے زور سے پیانو کی ٹکوں پر ہاتھ بھیرا اور مجھ سے کہا ”تمہیں پیانو بہت پسند ہے، بجانا سیکھنا چاہتے ہو.....؟“ میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا وہ مسکرائی، ”میں نے کل شام تمہاری اور مارتھا کی گفتگو سن لی تھی۔ تم چاہو تو ایسا پیانو پر مارتھا سے سیکھ سکتے ہو، تمہارے مالک سے اجازت میں تمہیں لے دوں گی۔ وہ میری کوئی بات نہیں نا لے“ میرا جی چاہا کہ اس سے پوچھوں کہ اس کریم خاص اور مہربانی کی کوئی وجہ بھی تو بتائیں۔ اس نے شاید خود ہی میری آنکھوں میں لکھا سوال پڑھ لیا۔ ”ہاں مگر بدلے میں تمہیں بھی مجھ سے کچھ تعاون کرنا

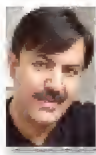
پڑے گا۔" کیا تعاون، میں کچھ سمجھا نہیں....." دوسرے جھٹک کر بولی۔ "جب سے میں اس محل میں آئی ہوں، مجھے یوں لگتا ہے، جیسے کسی قید خانے میں آئی ہوں، بہرہ و مجھ سے بہت محبت کرتے ہیں، بہت خیال رکھتے ہیں میرا۔ مگر میرے لیے ان کا یہ خوف اور احتیاط ایک انتہائی کبھی میرا دم گھونٹنے لگتی ہے۔ میں اپنی ہم عمر سہیلیوں سے ملنا چاہتی ہوں، ان کے ساتھ شہر میں گھومنا چاہتی ہوں، وہاں ترکی میں تو ہمیں کسی کھلی کی طرح آزادی پھرتی تھی، مگر یہاں مجھ پر بڑے پھرے ہیں۔" میں نے دھیرے سے سر ہٹھکائے جواب دیا۔ "یہ سب آپ ہی کی حفاظت کی خاطر کیا گیا ہے۔ مالک کے دشمن بہت ہیں۔ جو ہر پل انہیں نقصان پہنچانے کی تاک میں لگے رہتے ہیں۔" لیلیٰ نے اُداسی سے ایک سر آؤ بھری "جانتی ہوں میں، لیکن کیا تم نہیں سمجھتے کہ اس طرح بہروں میں نکلنے سے میں آغا کے دشمنوں کی نظر میں زیادہ نمایاں ہو جاؤں گی۔ اگر میں اسکارف اور نقاب کے ساتھ سارا دن بھی شہر میں گھومتی پھروں تو مجھے کوئی نہیں پہچان سکے گا۔" میں نے بے بسی سے اس ضدی لڑکی کی طرف دیکھا۔ "آپ مجھ سے کیا چاہتی ہیں؟" لیلیٰ نے غور سے میری طرف دیکھا، میری نظر خود بخود جھک گئی "میں صرف اتنا چاہتی ہوں کہ تم یوں دم بھلا بن کر میرے ساتھ نہ پھرا کرو۔ میری سہیلیاں کتنا مذاق اڑاتی ہیں، میں تمہیں بتا نہیں سکتی۔" میری نظر بے اختیار اٹھ گئی۔ لیلیٰ نے جلدی سے بات جوڑی "میری بات کا غلط مطلب مت لینا۔ میں تمہارا مذاق نہیں اڑا رہی۔ مگر جب ہم ساتھ چلتے ہیں، تو مذاق بن ہی جاتا ہے۔ میں صرف اتنا چاہتی ہوں کہ تم دکھاوے کے لیے میرے ساتھ گھر سے نکلا ضرور کرو، مگر کسی مال یا شاپنگ پلازا میں، نہیں اسکارف اور نقاب پہن کر اپنا حلیہ بدل لیا کروں گی۔ تم وہیں کسی کیفے میں بیٹھ کر میرا انتظار کیا کرنا، اور میں اپنی سہیلیوں کے ساتھ گھوم پھر کر دوبارہ وہیں آ جاؤں گا کروں گی، لیکن ہم دونوں گھر ایسے ہی آیا کریں گے، جیسے تم مستقل میرے ساتھ تھے۔ آغا بہرہ و کو مطمئن نہ رہے گا، تمہارا بھرم بھی سب پر قائم رہے گا، اور میں بھی کچھ گھنٹوں کے لیے اس ساری زنجیروں سے آزاد ہو کر اپنی زندگی کی تازگی لیا کروں گی..... بولو، میرا ساتھ دو گے پری فرا.....؟" اپنا نام لیلیٰ مبرا کی زبان سے سُن کر میں زور سے چونکا۔ اس نے اب تک کبھی مجھے یوں براہ راست نام لے کر مخاطب نہیں کیا تھا۔ کچھ لمبے، کچھ بولیاں کچھ تلفظ اور کچھ لہجوں کی ایک جھنجش ہی سے عام سے حرف و لفظ اور نام کتنے معتبر ہو جاتے ہیں۔ میرا دل بھی کتنا پاگل تھا، بیل بھری میں یہ بھول گیا کہ کل تک یہی عورت مجھے کس نفرت اور حقارت سے پکار رہی ہے، مگر میں اب تک اس لہجہ بدلنے کے فن اور ہنر سے ناواقف ہی تھا۔ لہذا میرا جواب بھی سیدھا سا اور سادہ تھا۔ "شاید مالک میرا یوں لاؤنچ میں بیٹھ کر بیٹھنا پسند نہ کریں۔ میری حدود اس لاؤنچ سے باہر تک ہیں،" لیلیٰ نے اس مسئلہ کا حل بھی چٹکیوں میں نکال لیا۔ "کوئی بات نہیں، تم اپنی انکسی میں بیٹھ کر پناہ گزین ہو جاؤ گے۔ اس کا انتظام بھی ہو جائے گا۔ میں آج ہی تمہارے لیے ایک نیا پناہ گزین کر دیتی ہوں۔ ویسے بھی بہت عرصے سے انکسی کی نئی ترین و آرائش کا سوچ رہی تھی۔ اسی بہانے یہ کام بھی ہو جائے گا۔" جواب میں کہنے کے لیے میرے پاس اب کچھ نہیں بچا تھا۔

اگلے دو دن کے اندر انکسی کو الٹ پلٹ کر رکھ دیا گیا، نیارنگ، نئے پردے، قالین، پینٹنگز، آرائش اور سب سے بڑھ کر سیاہ رنگ کا ایک بڑا سا خوب صورت پینا، جب کاری کرو پینا تو انکسی کے ہال میں رکھا کر اس کی فٹنگ کر رہے تھے، تو میں وہیں بیٹھا اپنے ایک دیدہ زیب خواب کو پورا ہوتے دیکھ رہا تھا۔ خواب حقیقت میں ڈھلنے لگیں تب بھی بہت دیر تک ہمیں خواب ہی لگتے ہیں۔ شاید انسان سدا کا بے اعتبار ہے یا پھر مجھ جیسے، جن کے خواب، سدا خواب ہی رہتے ہیں۔ اسی شام رہا تھا نے مجھے ایک گھنٹے کی ٹیوشن میں بیٹھ کر بنیادی کھوں اور سروں کے بارے میں پہلی کلاس دی، اور تیسرے دن میری انگلیوں نے پہلی مرتبہ کسی دھن کو چھیڑا۔ اس درمیان لیلیٰ دوسرے گھر سے باہر نکلے اور شہر کے وسط میں واقع ایک کثیرالمرکز شاپنگ مال میں داخل ہو کر اس نے اپنے منصوبے کے مطابق خود کو اسکارف اور نقاب سے ڈھانپ لیا۔ میں وہیں ایک کیفے میں بیٹھا اس کا انتظار کرتا رہا اور قریباً تین چار گھنٹے کے درمیان وہ واپس لوٹ آئی۔ اس مال کے دونوں طرف آنے اور جانے کے راستے واقع تھے اور لیلیٰ نے باہر نکلنے کے لیے پچھلے راستے کا انتخاب کیا تھا، پھر ایک دن کے وقفے کے بعد وہ اپنی اسی پہلی سے ملنے کے لیے گئی، جہاں میں بھی ایک بار اس کے ساتھ جا چکا تھا، مگر اس بار اس نے مجھے نچلے فلور ہی پر کھینکے کا اشارہ کیا اور خود گفت کے ذریعے اوپر چلی گئی۔ بہرہ و کے واپس آنے میں ابھی دو دن باقی تھے۔ میں نے لیلیٰ کی بات مان لی تھی، مگر میں اندر سے نہ جانے کیوں ایک عجیب سی بے چینی محسوس کر رہا تھا، میں جانتا تھا کہ میں بہرہ و کا حکم نہ مان کر بہت بُرا کر رہا ہوں، مگر لیلیٰ کی آزادی کی خواہش بھی مجھے جائز ہی لگ رہی تھی، عجیب کش مکش جاری تھی میرے دل و دماغ کے درمیان۔ دل کہتا تھا کہ لیلیٰ کا ساتھ دے کر میں نے کچھ غلط نہیں کیا، مگر دماغ کچھ الگ ہی راگ الاپ رہا تھا۔ جانے یہ دل اور دماغ نامی دوسو کنوں کی آپس میں کبھی کبھی فتنی کیوں نہیں۔ اور پھر، جب اس شش و پنج نے جب مجھے پوری طرح خدخال کر دیا، تو تیسرے دن لیلیٰ کے مال سے نکلنے سے پہلے ہی میں ایک فیصلے پر پہنچ چکا تھا۔ لیلیٰ جیسے ہی مال کے پچھلے دروازے سے باہر نکلے، میں بھی کیفے سے نکل کر اس کے پیچھے چل پڑا۔ لیلیٰ نے خود کو ایک لمبی سی عبا یا سے ڈھانپ رکھا تھا، دوسرے پارکر کے دوسری جانب بنے ایک پارکنگ میں پہنچی، جہاں پہلے سے ایک سیاہ لینڈ کرورر ناپ گاڑی اس کا انتظار کر رہی تھی۔

یہ گاڑی میں پہلے بھی لیلیٰ کی دوست کے پارکنگ کے نیچے کھڑی دیکھ چکا تھا، مطلب لیلیٰ اپنی اسی دوست سے ملنے جا رہی تھی یا اس کے ساتھ مل کر کہیں اور گھومنے جا رہی تھی۔ میں نے فوراً قریب سے گزرتی ٹیکسی کو ہاتھ دیا اور اسے آگے جاتی سیاہ گاڑی کے پیچھے چلے کو کہا۔ میں نے سوچ لیا تھا کہ میں لیلیٰ کو بتائے بغیر اس کی گمرانی جاری رکھوں گا، اس طرح میری الجھن کا حل بھی نکل آئے گا اور لیلیٰ کو بھی میری وجہ سے اپنی سہیلیوں اور رشتے داروں کے سامنے شرمندہ نہیں ہونا پڑے گا۔ وہی کی سرکوں کا ہجوم اور ٹیکسی کے لیے مقررہ دروازے کی حد ہماری گاڑی کی راہ میں حائل تھی۔ مگر ہم پھر بھی کسی نہ کسی طرح اس سیاہ بڑی گاڑی کا پیچھا کرتے رہے۔ لیکن، پھر ایک سنگل کے اچانک بند ہونے کی وجہ سے لیلیٰ کی گاڑی نظروں کے سامنے ہی دور ہوتی ہوئی، اوجھل ہو گئی۔ سنگل کھلنے کے بعد ٹیکسی ڈرائیور نے پوری کوشش کی کہ ہم دوبارہ اسے پکڑ سکیں، مگر ناکام رہے۔ تھک ہار کر ہم دوبارہ اسی مال کے باہر آ کر رک گئے، جہاں سے میں نے ٹیکسی پکڑی تھی۔ مجھے کیفے میں دو گھنٹے انتظار کرنا پڑا، جب کہیں جا کر لیلیٰ کی صورت، دکھائی دی۔ وہ بہت خوش نظر آ رہی تھی، ہم واپس گھر پہنچے تو لیلیٰ اتر کر اندر چلی گئی اور میں نے انکسی کی جانب قدم بڑھائے ہی تھے کہ میرے عقب میں ایک گرج دار آواز گونجی، اتنی دیر کہاں لگا دی تم لوگوں نے.....؟ میں گھبرا کر واپس پلٹا، کچھ فاصلے پر بہرہ و کریم کھڑا مجھے گھور رہا تھا۔

(جاری ہے)





..... ہاشم ندیم .....

ہاشم ندیم نو جوان نسل کے پسندیدہ، فنکار کے معروف و منفرد راما راکٹر، ناول نگار ہیں۔ ان کے ناول ”خدا اور محبت“ اور ”بچپن کا مہر“ نے بین الاقوامی پڑائی حاصل کی، تو جنگ، سنڈے میگزین میں شائع ہونے والے ناول ”عبداللہ“ کو بھی وقت کے پسندیدہ ترین ناول کا درجہ حاصل ہوا۔ انہیں ان کی ادبی خدمات پر حکومت پاکستان نے تمغہ حسن کارکردگی سے نوازا۔ نیز فلم کے شعبے میں ”عبداللہ“ نامی ایک بین الاقوامی فلم کے تخلیق کار کی حیثیت سے بھی قدم رکھ چکے ہیں۔

”پری ناز“ ایک اچھوتے، حساس اور قدرے مشکل موضوع پر مبنی بہت دل گدازنی تحریر ہے، یہ ایک ایسے شخص کی کہتا ہے، جسے اک کم صورتی کے عیب کے سبب، اس ظاہر پسند، زور پرست دنیا کے اُن گنت بد صورت رویوں، بد ہیئت آنکھوں کا سامنا کرنا پڑا۔ ناول سے متعلق اپنی آراء سے آگاہ کرنا ہرگز مت بھولے گا۔ ہمارا ہمارا ہی پرانا ہے:

ایڈیٹر ”سنڈے میگزین“ روزنامہ جنگ، شعبہ میگزین، اخبار منزل، آئی آئی چندر نگر روڈ، کراچی۔ ای میل:

sundaymagazine@janggroup.com.pk

بہروز کی آواز سن کر ایک لمحے کے لیے تو جیسے میرا خون ہی خشک ہو گیا۔ انسان بظاہر تو بڑے بڑے ڈاکے مار کر صاف بچ نکلتا ہے، مگر اس دل کے چور کی ایک چھوٹی سی چوری ٹھپانے نہیں نکھتی۔ میں نے بڑ بڑا کر بہروز کو سلام کیا۔ ”مالک آپ واپس آ گئے.....؟“ بہروز مسکرایا ”تو کیا کچھ غلط کیا واپس آ کر۔“ مگر تم لوگ اتنی دیر سے کہاں تھے؟“ میں نے نظریں اٹھکا کر صرف اتنا بتایا کہ مالک کو کچھ ضروری خریداری کرنی تھی، لہذا ہم شاپنگ مال تک گئے تھے۔ بہروز نے بظاہر اس بات کا کوئی خاص نوٹس نہیں لیا، مگر خود میرے اندر کی بے چینی بڑھتی جا رہی تھی۔ انسان کے جسم اور دماغ کو سٹلانے اور سن کر نے کے لیے بازار میں ہزار اور ویل جاتی ہیں، مگر سارے زمانے کے وید، حکیم اور طبیب مل کر بھی ایسی دوا ایجاد نہیں کر پائے، جو چند لمحوں کے لیے کسی کے جاگے ہوئے ضمیر کو سٹلا دے۔ بہروز کے گھر واپس لوٹنے کے بعد لٹلی نے باہر نکلتا کم کر دیا۔ اب دو تین چار دن بعد گھٹنے گھٹنے کے لیے باہر گھوم آیا کرتی، مگر زیادہ تر گھر بیٹھ بیٹھ رہتی۔ ان دنوں میں مجھے مار تھا سے پیا تو سیکھنے کا بھرپور وقت ملا اور سینے بھر میں، انگلیاں پیا نو پر خوب چلنے لگیں۔ خود مار تھا بھی میری اس تیز پیش رفت اور لگن سے بہت خوش تھی۔ ایک شام میں تباہیابیابا نو پر کسی نئی دھن کی شق کرتے ہوئے اپنے آپ میں اس قدر لگن ہو گیا کہ مجھے انگلیسی کے دروازے سے اندر ہال تک آتی قدموں کی چاپ بھی سنائی نہ دی اور چونکا اُس وقت، جب پس منظر میں بہروز کریم کی بھاری آواز گونجی۔ ”اچھا بچا لیتے ہو.....“ میں گھبرا کر چونک سا گیا اور جلدی سے کھڑا ہو گیا۔ ”معاف کیجئے مجھے آپ کے آنے کا پتا نہیں چلا۔“ بہروز نے غور سے میری طرف دیکھا۔ ”انسان کو اپنے اندر اتنا لگن نہیں ہونا چاہیے کہ اپنی طرف بڑھنے والے قدموں کی چاپ بھی نہ سنائی دے۔ آنے والا دشمن بھی ہو سکتا ہے۔“ میں نے دوبارہ معذرت کی۔ اس نے آگے بڑھ کر پیا نو کی بے داغ سطح پر ہاتھ پھیر کر اسے غور سے دیکھا۔ ”مجھے حبانے بتایا تھا کہ اس نے انگلیسی میں پیا نو رکھوا دیا ہے۔ تم نے بہت تھوڑی مدت میں اپنی مالک کا اعتبار جیت لیا، حالانکہ لٹلی صابھی عورت کے خیالات اپنے حق میں بدلنا بہت مشکل کام ہے..... ایسا کیا جاوے ہے تمہارے پاس بڑی ناز، ہمیں بھی تو بتاؤ.....؟“ میں نے چونک کر بہروز کی طرف دیکھا مگر اس کے چہرے پر حسب معمول کوئی مثبت یا منفی تاثر نہیں تھا۔ میں نے کہیں پڑھا تھا کہ ایسے بے تاثر چہرے والے لوگ، بہت غیر متوقع شخصیت کے مالک ہوتے ہیں۔ میں پُپ رہا۔ بہروز چند ضروری ہدایات دے کر واپس پلٹ گیا۔

اگلے ہفتے کی ابتدائی سے محل کی نئی سجاوٹ اور تزئین شروع ہو گئی۔ پتا چلا کہ دو دن بعد لٹلی صاب کی سال گرہ ہے اور بہروز پچھلے سال کی طرح اسے انتہائی دھوم دھام سے منانا چاہتا ہے۔ لٹلی بھی انتہائی خوش دکھائی دیتی تھی، مگر نہ جانے کیوں مجھے لٹلی کے اس کھلے ہوئے چہرے کے پیچھے کبھی کبھی ایک بڑی گہری آواز سی جھمی دکھائی دیتی۔ شاید بہت زیادہ خوشی اور اطمینان بھی اپنے ساتھ ایک نامعلوم سی آوازی لے کر وارد ہوتے ہیں یا پھر ساری بات تو اس کی ہے۔ تھوڑی سی پریشانی، بے قراری اور بے چینی بھی ضروری ہے، زندگی کے ترازو کو برابر رکھنے کے لیے۔ اگلے روز جب بہروز سال گرہ کی تیاریوں میں مصروف تھا اور محل کے دالان میں بیٹھا ہم سب کو مختلف ہدایات دے رہا تھا کہ اچانک فیروز خان پریشانی میں تیز تیز قدم اٹھاتا بہروز کے قریب آیا اور تھک کر بہروز کے کان میں کوئی بات کہی۔ ”لٹلی بھی اسی وقت وہاں پہنچی تھی، اس نے بہروز کے چہرے پر پریشانی اور انگلیش کے آثار دیکھے تو فیروز خان کو جھڑک دیا۔“ ”جس میں کتنی بار منع کیا ہے میں نے فیروز، یوں وقت بے وقت انہیں پریشان مت کیا کرو۔“ فیروز سر جھکائے کھڑا رہا۔ بہروز نے فیروز کی طرف دیکھ کر کہا۔ ”ایک آدھ دن آگے نہیں ہو سکتا یہ سودا.....؟“ ”نہیں مالک! دو لوگ بہت دور سے آئے ہیں۔ اتنا کہا انتظار نہیں کریں گے ہمارا۔ ان کا زیادہ دیر جزیروے پر انتظار کرنا بھی خطرے سے خالی نہیں۔“ بہروز نے ایک گہری سانس لی ”مگر فیروز خان! تم جانتے ہو کل تمہاری مالک کی سال گرہ ہے، اور میں پورا سال اس دن کا انتظار کرتا رہا ہوں۔“ ”لٹلی نے چلا کر پوچھا۔“ ”کوئی مجھے بھی بتائے گا۔ یہ سب کیا چل رہا ہے.....؟“ بہروز نے ہنسنے سے لہجے میں لٹلی کو بتایا کہ ایک بہت ضروری سوئے کے لیے اسے دور اتوں کے لیے ایک قریبی جزیروے پر جانا تھا۔ یہ سودا پہلے سے طے شدہ تھا، مگر فیروز نے ابھی آکے بتایا کہ انہیں آج شام ہی نکلتا ہوگا۔ لٹلی یہ سنتے ہی غصے سے کھڑی ہو گئی۔ ”ٹھیک ہے آغا تو پھر آپ جا کیں اپنے ضروری سوئے کے لیے، مگر مجھ سے بھی دوبارہ کبھی بات کرنے کی کوشش نہ کیجیے گا۔ نہیں منائی مجھے کوئی سال گرہ وغیرہ۔“ لٹلی ہر دھن سے اندر چلی گئی اور بہروز اسے آوازیں دیتا رہ گیا۔ لٹلی کے جانے کے بعد بہروز نے ہنسنے سے گھور کر فیروز کی طرف دیکھا۔ ”کردیا ناں اسے ناراض، فیروز خان۔ تم کبھی موقع مل دیکھ کر بات نہیں کرتے۔ جاؤ، چلنے کی تیاری کرو۔ میں اسے سنا کر آتا ہوں۔“ ”بہروز بھی اٹھ کر اندر چلا گیا۔ جانے اس نے کس طرح اپنی محبوب بیوی کو رضامند کیا ہوگا، مگر جب شام کو وہ گھر سے رخصت ہونے کے لیے نکلا تو لٹلی صابھی اسے پوری تک چھوڑنے کے لیے آئی، البتہ اس کے چہرے پر غصے کے آثار ابھی تک نمایاں تھے اور وہ بھی کبھی سی دکھائی دے رہی تھی۔ بہروز کریم جانے سے پہلے جلد واپس لوٹنے اور پھر بہت دن اس کے ساتھ رہنے کے وعدوں کے ساتھ رخصت ہو گیا۔ لٹلی بھی پلٹ کر اندر چلی گئی۔ انسان ساری زندگی وعدے کرنے اور وعدے نبھانے کی زنجیر ہی سے بندھا رہتا ہے اور شاید ہم دوسروں سے

کیے وعدے تو نبھا بھی لیتے ہیں، مگر اپنے آپ سے کیے وعدے سے سدا دوفا ہوئے۔ اس کا انتقام دہریہ کرتے رہتے ہیں۔ میں نے بھی اپنے آپ سے ایک وعدہ کیا تھا کہ اب اگر لیلیٰ نے مجھ سے کہیں اسکیلے جانے کی ضد کی تو میں اسے صاف بتا دوں گا کہ میں بہروز کے ساتھ مزید غداری نہیں کر سکتا۔ ہاں، یہ غداری ہی تو تھی کہ میں بہروز کی وی ہوئی ہدایات پر پوری طرح عمل نہیں کر پا رہا تھا۔ دوسرے روز حسب توقع لیلیٰ نے سر شام ہی کہیں جانے کی ٹھان لی۔ اور ہم گاڑی میں ان ہی اپارٹمنٹس کی پارکنگ میں پہنچ گئے، جہاں ساتویں منزل پر لیلیٰ کی سیٹیل رہتی تھی۔ میں نے لیلیٰ سے دے لفظوں میں کہا کہ ہمیں یہاں زیادہ دیر نہیں ٹھہرنا چاہیے، کیوں کہ مالک نے مجھ جاتے ہوئے خاص طور پر ہدایت کی ہے کہ ان دنوں میں لیلیٰ کے ساتھ کہیں بھی باہر نکلنے سے گریز کروں، کیوں کہ وہ جس بڑے کاروباری سودے کے لیے گھر سے جا رہے ہیں، وہ اس کے حریفوں کے دلوں میں کاروباری رقابت کی آگ مزید سلگا کر انہیں کوئی بھی انتہائی قدم اٹھانے پر مجبور کر سکتا ہے۔ لیلیٰ نے میری بات سن کر ایک گہری سانس لی۔ ”ہاں، وہ جاتے ہوئے مجھے بھی گھر سے نہ نکلنے کی تاکید کر گئے ہیں۔ مگر تم فکر نہ کرو۔ میں جلدی مل کر وہاں آ جاؤں گی۔ میری دوست نے میری سالگرہ کے لیے خاص اہتمام کر رکھا ہے۔ نہ آتی تو وہ مجھ سے ناراض ہو جاتی۔“ لیلیٰ تیزی سے لفٹ کی جانب بڑھ گئی اور میں اپنے ساتھ کیے وعدے کی لاش اپنے کانٹھوں پر اٹھائے، وہیں تہہ خانے کی پارکنگ میں کڑوا کر اتر گیا۔

شام تیزی سے ڈھل رہی تھی اور پارکنگ لائٹ میں گئی جتیاں دھیرے دھیرے ایک ایک کر کے جلتا شروع ہو چکی تھیں۔ جب لیلیٰ کو گئے تین گھنٹے سے زیادہ ہونے کو آئے تو میں نے خود اوپر جانے کا فیصلہ کر لیا۔ ابھی قدم بڑھائے ہی تھے کہ لیلیٰ تیزی سے لفٹ سے نکل کر میری جانب بڑھتی نظر آئی۔ وہ اپنا اسکارف لپیٹ کر پرس میں رکھ رہی تھی۔ ”آپ نے بہت دیر کر دی۔“ آج تو ہم نے آتے وقت آپ کی ہدایت کے مطابق حفاظت کی گاڑی کو بھی منزل سے آگاہ نہیں کیا تھا، وہ سب وہاں گھر میں بے چین ہوں گے۔“ لیلیٰ نے جلدی سے گاڑی کا دروازہ کھولا۔ ”ہاں! بس دیر ہو گئی، مگر اب چلو۔ ہمیں وہاں گھر میں یہی تاثر دینا ہے کہ ہم قریبی مال سے روزمرہ کی چند ضروری چیزیں لینے کے لیے اچانک نکل گئے تھے، لہذا بتانے کا موقع ہی نہیں ملا۔“ میں بھی جلدی سے گاڑی کی طرف بڑھا اور ٹھیک اسی وقت تہہ خانے کی مصنوعی سرفضا میں ایک بھاری آواز گونجی۔ ”اسی بھی کیا جلدی ہے جان! آغا! دیکھو ہم تو تمہاری تلاش میں خود ہی چل کر یہاں تک آ پہنچے ہیں۔“ میرے قدموں تلے زمین سرک گئی، دور اندھیرے میں ایک ستون کی آڑ میں کھڑی گاڑی سے بہروز کریم اور فیروز خان اتر کر تمہاری جانب بڑھتے دکھائی دیئے۔ پس منظر میں حفاظتوں کی وہ جھپٹ نظر آئی، جسے میں اور لیلیٰ اپنی دانست میں چمکے دے کر گھر ہی میں چھوڑ آئے تھے۔ لیلیٰ کے چہرے کا رنگ بھی پل بھر میں زرد پڑ گیا اور میں نے اس کے جسم میں باقاعدہ کاپٹے جیسی لرزش دیکھی۔ بہروز نے لیلیٰ کے قریب پہنچ کر پیار سے اس کی ٹھوڑی اٹھا کر لیلیٰ کا ٹھککا ہوا چہرہ بلند کیا۔ ”یہ کیا بات ہوئی جان! آغا! میرے منہ کرنے کے باوجود تم گھر سے نکل آئیں۔ کیا کوئی نئی سیٹل بنائی ہے تم نے یہاں۔ ہمیں بھی تو اس سے ملو!۔“ جس کے پیار میں اتنی کشش ہے کہ تم اپنے محبوب آغا کے حکم کا مان بھی نہ کرہے پائیں۔“ لیلیٰ نے جلدی سے ٹھک کر بہروز کے پاؤں پکڑ لیے ”معاف کر دیں مجھے آغا! بڑی بھول ہو گئی مجھ سے۔ مجھے واقعی گھر سے باہر نہیں نکلنا چاہیے تھا۔ مگر میں کسی کی باتوں کے بہکاوے میں آ گئی تھی۔ آئندہ ایسی غلطی کبھی نہیں ہوگی۔“ بہروز کا چہرہ اب بھی سپاٹ تھا۔ ”میں تمہیں تو معاف کر دوں گا جان! آغا! مگر اے کبھی معاف نہیں کروں گا، جس نے تمہیں بیکا کر گھر سے نکالا اور میری حکم عدولی کی۔ بتاؤ، کون ہے وہ بد نصیب.....“ لیلیٰ نے اپنا آنسوؤں سے بیگا چہرہ اٹھایا ”کہنا نا آغا، بڑی غلطی ہو گئی۔ میں گھر میں بیٹھے بیٹھے اب گئی تھی۔ اس لیے یہاں چلی آئی۔ یہاں ٹاپ فلور پر ایک اچھا رستوران ہے۔ سوچا، کافی پی کر دل بہلا لوں گی۔ اور مجھے اس بات کا بہت افسوس ہے۔“ بہروز نے دوبارہ سختی سے پوچھا ”کون ہے وہ، جس نے تمہیں یہاں آنے پر مجبور کیا.....؟“ لیلیٰ دھیرے دھیرے کھڑی ہو گئی اور اس نے اپنی انگلی میری جانب اٹھا دی۔ ”یہ بڑی زائد..... یہی مجھے اس طرح کی اتنی سیدی پٹیاں پڑھانا رہتا تھا کہ یہ زندگی میری اپنی ہے، مجھے اسے اپنی مرضی سے جیننا چاہیے۔ میں کوئی بجنرے میں قید، قیدی تو نہیں ہوں کہ ہر لوگ گھٹ کر دیوں۔“ لیلیٰ چیخ چیخ کر مجھ پر الزام لگاتی رہی اور میں تو جیسے پل بھر میں اپنے حواس کھو بیٹھا تھا۔ مجھ سے کچھ کہا ہی نہیں گیا۔ ایک لمحے کو میری لیلیٰ سے نظریں اور مجھے لگا، میرے سامنے لیلیٰ نہیں نابید کھڑی ہے اور ہم دہن میں نہیں، میرے پرانے محلے میں کھڑے ہیں۔ بہروز کریم نے اطمینان سے لیلیٰ سہا کی بات سنی اور میری طرف چلا ”اچھا..... تو یہ ہے وہ نمک حرام..... اس سے مجھے ایسی امید ہرگز نہ تھی۔ مگر جان آغا، تمہیں تو کچھ خیال کرنا چاہیے تھا ناں۔ اگر اس کی نیت میں کوئی فتور پیدا ہو جاتا تو میرے دشمنوں کے ساتھ مل کر یہ تمہیں کوئی نقصان پہنچا دیتا تو سوچو، پھر میرا کیا ہوتا۔“ مجھے ایک غلام کی باتوں میں نہیں آنا چاہیے تھا۔ ”لیلیٰ روتے ہوئے گزرتی“ آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں آغا، اس بڑی زائد نے اپنے ذرا سے فائدے کے لیے مجھے میری راہ سے ہٹا دیا۔ میری ہم ردی حاصل کرنے کے لیے میرے دل میں بغاوت کی چنگاری بھڑکا دی۔ آپ تو جانتے ہیں، میں آپ کے جانتی تہا پڑ جاتی ہوں۔ یہ ضرور مجھے کوئی نقصان پہنچانا چاہتا ہو گا۔ تب ہی مجھے یوں اسکیلے گھر سے نکلنے پر اکسایا۔ اچھا ہوا آپ لوگ ٹھیک وقت پر یہاں پہنچ گئے۔“ میں حیرت سے نگاہ اور اپنی جگہ جما کھڑا لی کی یہ ساری خرافات سننا رہا۔ بہروز دھیرے دھیرے چلتا میرے قریب آیا اور اس کی آنکھیں میری آنکھوں میں گونج گئیں۔ ”تم بتاؤ بڑی زائد..... کیا لیلیٰ ٹھیک کہہ رہی ہے؟ اور کوئی بھی جواب دینے سے قبل اتنا ضرور سوچ لینا کہ بہروز کریم کی عدالت میں غداری کی صرف ایک سزا مقرر ہے، سزائے موت۔“ میں نے ایک پل کے لیے نظر اٹھا کر لیلیٰ کی طرف دیکھا۔ وہ لعلی کی کڑی تھی۔ بہروز دوسری بار زور سے چلا ”جواب دو!۔“ کیا یہ سچ ہے.....؟“ میں نے سر نہکا لیا ”ہی ہاں، مگر کہہ رہی ہیں، سچ کہہ رہی ہیں۔ میں ہی انہیں بہانے سے گھر سے باہر لے کر آیا تھا۔“ ایک لمحے کے لیے لیلیٰ کی آنکھوں میں بے یقینی کی ایک چمک لہرائی، مگر پھر فوراً ہی اس نے خود کو ناپل کر لیا۔ بہروز کریم نے سر سرائی آواز میں مجھ سے پوچھا ”کوئی آخری خواہش ہو تو بتا دو۔ تمہاری شفقت کی چند سانس باقی رہ گئی ہیں۔“ میں نے بہروز کی طرف دیکھا ”جی مالک..... بس ایک آخری خواہش ہے۔ مجھے مارنے کے بعد میرا چہرہ مسخ کر دیجیے گا۔ میں نے یہ زندگی تو جیسے تھے اس چہرے کے ساتھ گزار لی۔ مگر میں قبر میں اس شناخت کے ساتھ ہرگز نہیں جانا چاہتا۔“ بہروز کچھ دیر تک میری طرف دیکھتا رہا، مجھے اس کے لہجے میں پہلی بار اپنے لیے غصے سے زیادہ افسوس کا عنصر محسوس ہوا۔ ”جانتے ہو، مرد کی بادی